مارچ ۱۹۹۴

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

- اسلام کے دو معاشی نظام
- اسلام کی دو سالانہ عیدیں

امیر تنظیم اسلامی، ڈاکٹر اسرار ا

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

تنظیم اسلامی پاکستان کے تحت سال 1994ء کے لئے

علاقائی اجتماعات و تربیت گاہوں کا تبدیل شدہ شیڈول

	علاقائی اجتماعات	تربیت گاہ	مقام
①	8 تا 10 اپریل	11 تا 14 اپریل	راولپنڈی
②	29 اپریل تا یکم مئی	2 تا 5 مئی	لاہور
③	27 تا 29 مئی	30 مئی تا 2 جون	فیصل آباد
④	12 تا 14 اگست	15 تا 18 اگست	پشاور
⑤	9 تا 11 ستمبر	12 تا 15 ستمبر	ملتان

راولپنڈی، لاہور اور ملتان کے علاقائی اجتماعات کے ساتھ

توسیعی مشاورت کا پروگرام

بالترتیب 8/اپریل، 29/اپریل اور 10/ستمبر کو ہوگا۔ ان شاء اللہ

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

جلد: ۴۳
شمارہ: ۳
رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ
مارچ ۱۹۹۴ء
فی شمارہ ۷/-
سالانہ زرتعاون ۷۰/-

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

برائے سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، متحدہ عرب امارات اور بھارت	۴۵ سعودی ریال یا ۱۲ امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک جاپان وغیرہ۔	۱۶ امریکی ڈالر
شمالی وجنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ۔	۲۰ امریکی ڈالر
ایران، عراق، اومان، مسقط، ترکی، شام، اردن، بنگلہ دیش، مصر	۹ امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ - فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی - فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

☆ عرض احوال ——— ۳

حافظ عاکف سعید

☆ پریس ریلیز ——— ۵

سنگین ملکی صورت حال کے بارے میں امیر تنظیم اسلامی کا تجزیہ

☆ تذکرہ و تبصرہ ——— ۷

اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں تدریج اور اس کے تقاضے

ڈاکٹر اسرار احمد

☆ نشری تقریر ——— ۱۷

اسلام کی دو سالانہ عیدیں اور فقراء و مساکین کا لحاظ

ڈاکٹر اسرار احمد

☆ تفکر و تدبر ——— ۲۱

اسلام کے دو معاشی نظام

ڈاکٹر اسرار احمد

☆ آداب معاشرت ——— ۴۷

عید کے موقع پر مصافحہ اور معانقہ

مفتی عبدالرؤف

☆ رفتار کار ——— ۵۶

علاقائی اجتماع حلقہ سندھ و بلوچستان

مرتب: نجیب صدیقی

The Role of Judiciary and the Objectives Resolution(III)

By Sardar Sher Alam

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض احوال

زیرِ نظر شمارہ جب تک قارئین کے ہاتھوں میں پہنچے گا ماہ رمضان المبارک کی مبارک ساعات میں سے دو تہائی گزر چکی ہوں گی اور اس کے آخری عشرے کا آغاز ہو چکا ہو گا۔ یوں تو یہ پورا مہینہ ہی خیر و برکت کے اعتبار سے سال کے تمام مہینوں میں امتیازی مقام کا حامل ہے اور اسی اعتبار سے اسے نیکیوں کا موسم بہار قرار دیا جاتا ہے'------ چنانچہ اس ماہ کی سعادتوں اور برکتوں سے محروم رہ جانے والے شخص کے لئے ایک حدیث میں بڑے سخت کلمات وارد ہوئے ہیں' یہ حدیث بہت مشہور ہے اور متعدد کتب احادیث میں وارد ہوئی ہے کہ ایک بار حضور ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمانے کے لئے منبر کے پہلے درجے پر قدم رکھا تو خلاف معمول آپ کی زبان سے نکلا' آمین۔ پھر دوسرے اور تیسرے درجہ پر قدم مبارک رکھنے پر یہی الفاظ آپ کی زبان پر آئے۔ بعد میں صحابہ کرامؓ کے دریافت کرنے پر آپ نے فرمایا کہ جبرئیلؑ میرے سامنے آئے تھے' جب میں نے پہلے درجے پر قدم رکھا تو انہوں نے کہا "ہلاک ہو جائے وہ شخص جس نے رمضان کا مبارک مہینہ پایا اور پھر بھی اس کی مغفرت نہیں ہوئی (یعنی وہ اپنی مغفرت کا سامان نہ کر سکا)" اس پر حضور ﷺ نے فرمایا آمین' اسی طرح دو اور بد بخت افراد کے لئے حضرت جبرئیلؑ نے بد دعا دی اور آپؐ نے ہر بار فرمایا' آمین------ لیکن اس ماہ مبارک کے آخری عشرہ کو تو بالخصوص سعادتوں اور برکتوں کے اعتبار سے پورے ماہ کا نقطہ عروج قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی میں وہ مبارک شب بھی ہے جسے قرآن حکیم نے لیلۃ القدر کا نام دیا ہے اور جس میں عبادت کو ایک ہزار ماہ کی عبادت سے افضل قرار دیا ہے۔ (لَیْلَۃُ الْقَدْرِ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَھْرٍ) اس آخری عشرے میں نیکیوں کی دولت سمیٹنے میں کوتاہی کرنا یقیناً بہت بڑی محرومی ہے۔ آں حضور ﷺ خود اس آخری عشرے کے لئے کس درجے اہتمام فرماتے تھے اس کا کسی قدر اندازہ اس حدیث مبارکہ سے ہوتا ہے جو صرف بخاری اور مسلم ہی میں نہیں صحاح کی قریباً تمام کتابوں میں مذکور ہے:

> عن عائشۃؓ قالت کان النبیُّ ﷺ اذا دخل العشرُ شَدَّ مِئزَرہٗ واَحیا لَیلہٗ واَیقظا ھلَہٗ
>
> ام المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ جب (ماہ رمضان کا آخری) عشرہ شروع ہوتا تو نبی اکرم ﷺ اپنی کمر کس لیتے تھے (گویا عبادت و ریاضت کے لئے کمربستہ ہو جاتے تھے) پوری رات جاگا کرتے اور اپنے گھر والوں کو بھی (عبادت کے لئے) جگایا کرتے تھے۔

یہاں اس امر کا تذکرہ بھی بے موقع نہ ہو گا کہ بحمد اللہ جامع القرآن' قرآن اکیڈمی لاہور میں امیر تنظیم کا دورۂ ترجمہ قرآن کا پروگرام نہایت عمدہ طریقہ پر ہو رہا ہے۔ شرکاء کی تعداد اور ان کے رجوع کے اعتبار سے یہ سابقہ تمام پروگراموں سے زیادہ کامیاب اور بھرپور ہے۔ اس پروگرام کا دورانیہ کم و بیش چھ گھنٹے بنتا ہے' نماز عشاء ساڑھے آٹھ بجے شب ادا کی جاتی ہے اور فارغ ہوتے بالعموم' زحافی بج جاتے ہیں۔ قرآن حکیم کے ساتھ تجدید تعلق کی اس سعادت سے جو لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس میں شریک تمام افراد کی اس محنت کو شرف قبول عطا فرمائے' آمین۔

☆ ☆ ☆

ایک اہم وضاحت

گزشتہ دو سالوں کے دوران "میثاق" میں "کبائر" کے نام سے ایک نہایت معلومات افزا سلسلہ مضمون بالاقساط شائع ہو تا رہا ہے جس میں کبیرہ گناہوں اور ان کی شناعت پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس مضمون کے مؤلف ہمارے ایک دوست جناب مولانا شبیر نورانی صاحب ہیں جو آجکل سعودی عرب میں مقیم ہیں۔ یہ سلسلۂ مضمون ابھی پندرہ کبیرہ گناہوں کے تذکرے تک پہنچا تھا کہ مؤلف نے اسے وقتی طور پر موقوف کر دیا۔ ان کے پیش نظر غالباً ابو داؤد کی کوئی طویل روایت ہے جس میں ستر کبیرہ گناہوں کا ذکر ہے اور وہ اسی ترتیب سے اپنی کتاب مرتب کر رہے ہیں۔ ان کا خیال بنا سروست پندرہ کبیرہ گناہوں کے ذکر پر مشتمل کتاب کی جلد اول شائع کر دی جائے' چنانچہ انہوں نے ایک اشاعتی ادارے (اسلامک پبلیکیشنز) سے معاملہ طے کیا اور کتاب چھپ کر مارکیٹ میں آگئی۔

اس اشاعتی ادارے سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے کتاب کے ٹائٹل پر جلد اول نہیں لکھا اور کتاب کے مؤلف نے بھی دیباچے میں اس نوع کی کوئی صراحت نہیں کی۔ کتاب پر اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ اس میں زنا کو کبیرہ گناہوں میں شامل نہیں کیا گیا بلکہ اس کتاب کے حوالے سے ایک طبقہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے خلاف یہ پروپیگنڈہ کر رہا ہے کہ ڈاکٹر صاحب زنا جیسے جرم کو کبیرہ گناہ نہیں سمجھتے۔ یہ الزام بالکل غلط ہے۔ اولاً نہ تو یہ مضمون ڈاکٹر صاحب کا تحریر کردہ ہے اور نہ یہ کتاب ان کے ادارے نے شائع کی ہے' ثانیاً حقیقت واقعہ یہ ہے کہ زنا کو محترم ڈاکٹر صاحب کبائر میں ہی نہیں "اکبر الکبائر" میں شامل کرتے ہیں۔ وہ اس کی جس شدومد سے مذمت کرتے ہیں اور الفاظ قرآنی "وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا" کے حوالے سے جس اہمیت کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں وہ ان کے رفقاء و احباب سے مخفی نہیں------ مذکورہ کتاب کے حوالے سے مؤلف کی جانب سے بھی اس وضاحت کا شائع کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ مطبوعہ کتاب اصل کتاب کی جلد اول کی حیثیت رکھتی ہے' زنا کا ذکر دوسری جلد میں آئے گا۔ مؤلف کے نزدیک بھی زنا یقینی طور پر کبیرہ گناہوں میں شامل ہے۔OO

پریس ریلیز

ملک ایک بار پھر مہیب خطرات سے دوچار ہے!

پاکستان کی داخلی و خارجی صورتحال کے بارے میں امیر تنظیم اسلامی کا تجزیہ

لاہور۔۲۵ فروری: امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ ریاستی راز کے افشاء پر بے نظیر بھٹو کو قومی مجرم گردانا جائے تو یہ اپنی جگہ حق ہے' لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک بار پھر ہمارے لئے اس شر میں سے ایک خیر ضرور برآمد کر دیا ہے' کیونکہ خالصتان کی تحریک کی کامیابی کسی بھی طرح پاکستان کے مفاد میں نہ تھی۔ مسجد دارالسلام باغ جناح میں اجتماع جمعہ سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ایک سکھ لیڈر کے اس بیان سے ہمیں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہئے جس میں انہوں نے پیپلز پارٹی کی قیادت سے شکوہ کرتے ہوئے جتلایا ہے کہ سکھوں نے پاکستان سے تو ایک مربع انچ زمین بھی نہیں مانگی تھی۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے اس یقین کا اظہار کیا کہ آزاد خالصتان کے قیام کے بعد سکھوں کی نظروں کا ہمارے پنجاب پر اٹھنا یقینی امر تھا کیونکہ ان کے مقدس ترین مقامات پاکستان میں واقع ہیں اور ان کے قول و عمل پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوؤں کا آلہ کار بن کر سکھوں نے ۱۹۴۷ء میں کیا مسلمانوں کے ساتھ درندگی نہیں کی تھی؟۔

امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ میاں نواز شریف کے اس سوال کا جواب تاحال وزیر اعظم کی طرف سے نہیں آیا کہ راجیو گاندھی کو سکھوں کے خلاف کیا مدد دی گئی تھی اور جب تک اس کی نوعیت معلوم نہ ہو کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا' لیکن اگر وہ نہ بتائیں تو ظاہر ہے کہ لوگوں کو قیاس سے کام لینے کا حق ہے' جو یہ ہے کہ آزادی کے لئے لڑنے والے سکھوں کی فہرستیں راجیو گاندھی کو مہیا کر دی گئی تھیں جنہیں چن چن کر مار دیا گیا اور خالصتان کی تحریک دم توڑ گئی۔ اس خیال پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اگر ہماری پچھلی حکومتیں اعلانیہ انکار کے باوجود سکھوں کی اخلاقی مدد سے بڑھ کر کوئی عملی مدد بھی کر رہی تھیں تو یہ ہمارے اخلاقی و دینی اصولوں اور بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی تھی' لیکن اس کے باوجود بے نظیر نے فہرستیں بھارتی حکومت کے حوالے کر کے ایک سنگین قومی جرم کیا جس پر گرفت ہونی چاہئے۔ ملک میں ایسا کوئی ادارہ موجود ہے جس کے دائرہ کار میں یہ اختیار آتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ ریاستی راز کو دشمن تک پہنچانے کے جرم کی قرار واقعی سزا دے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے ان بحرانوں کا ذکر کرتے ہوئے جو بین الاقوامی سطح پر ملک کو درپیش ہیں خاص طور پر مسئلہ کشمیر اور افغانستان کا حوالہ دیا۔ انہوں نے کہا کہ خود بھارتی دانشوروں کی تحریروں سے اس امید کی کلی ذرا کھلی تھی کہ کشمیر کے معاملے میں بھارتی قیادت اب عقل کے ناخن لے گی لیکن معلوم ہوا کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے اور بھارت نے بھی زمانے بھر کی باتوں کا کوئی اثر نہیں لیا بلکہ ہمارے

لئے یہ بات بھی فکر مندی کی ہے کہ اس دفعہ اپنے دورے میں وزیر اعظم مسئلہ کشمیر پر چین سے پاکستان کے حق میں کوئی واضح اور زور دار بات نہیں کہلوا سکیں۔ چین کی اپنی مشکلات اور اپنے مسائل ہیں اور وہ امریکہ اور بھارت کی خوشنودی کو اب زیادہ اہمیت دینے لگا ہے جنہیں اصل استعمار یعنی صیہونیت کی پشت پناہی بھی حاصل ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے افغانستان میں جہاد کے فساد میں بدل جانے پر عمومی تشویش کے اظہار کے ساتھ ان تازہ واقعات کی نزاکت پر خاص زور دیا جو پشاور سے بچوں کی بس کے اغواء کے بعد افغان ہائی جیکروں کے مارے جانے پر سامنے آئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کابل میں پاکستانی سفارت خانے اور طور خم میں پاکستانی چوکی پر حملے ہمیں خوفناک سگنل دے رہے ہیں کیونکہ لاکھوں افغانیوں کی ہمارے ملک میں موجودگی جن میں سے بہت سے مسلح اور تربیت یافتہ بھی ہیں' ہماری قومی سلامتی کے لئے ایک مستقل خطرہ ہے۔

ملک کو درپیش داخلی بحرانوں میں ڈاکٹر اسرار احمد نے حزب اختلاف اور حکومت کے درمیان لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی محاذ آرائی کو سرفہرست رکھا اور قوم کو خبردار کیا کہ میاں نواز شریف لوگوں کو سڑکوں پر لانے کی جو باتیں کر رہے ہیں ان میں وزن موجود ہے۔ انہوں نے کہا کہ احتجاجی تحریکیں شہروں سے ہی اٹھتی ہیں اور وہیں زور پکڑتی ہیں اور امر واقعہ یہ ہے کہ بڑے شہر' ان کے تاجر اور متوسط طبقات اپوزیشن کے ہاتھ میں ہیں' چنانچہ وہ اپنی دھمکیوں کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں' لیکن اس کا نتیجہ کچھ اسی طرح کا ہو گا جیسا ہمیشہ نکلتا آیا ہے کہ بھاری بوٹوں کی چاپ سارے شور و شغب پر غالب آجائے یا پھر وہ ہو گا جس کی طرف جنرل مرزا اسلم بیگ اشارے کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے شمال کی جانب صوبہ سرحد میں پیش آنے والے ہماری پارلیمانی تاریخ کے بدترین واقعات کی مذمت کی جس نے عدالتی' دستوری اور پارلیمانی ہر سطح پر بحران کو جنم دیا ہے اور خبردار کیا کہ ولی خان کی باتوں سے خون کی بو آتی ہے۔ انہوں نے جنوب میں سندھ کی صورت حال کو بھی بحرانی قرار دیا جہاں از کار رفتہ بوڑھے جی ایم سید کو ایک بار پھر اونچی آواز میں ہانک لگانے کی ہمت ہو گئی ہے۔ افہام و تفہیم میں دل و دماغ کی صلاحیتیں آزمانے کی بجائے پیپلز پارٹی نے ان کے ایک ممبر صوبائی اسمبلی کو وزیر بنا کر ایم کیو ایم میں بھی نقب لگادی اور وہاں سے بھی ایک لوٹا بر آمد کر لیا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے ان سب بحرانوں کا حل تجویز کرتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و نصرت کے حصول کی کوشش کی جانی چاہئے جس کے لئے توبہ شرط لازم ہے جبکہ اجتماعی سطح پر تو کیا ہم انفرادی سطح پر بھی توبہ نہیں کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک میں کتاب و سنت کی مکمل بالادستی کے لئے ایک عوامی تحریک چلائی جانی چاہئے جسے چلانے والوں نے اپنے آپ پر بھی کتاب و سنت کے احکام کو عملاً نافذ کر لیا ہو۔ پھر یہ اعلان بھی ضروری ہے کہ اس تحریک کا کشمکش اقتدار سے ہرگز کوئی تعلق نہیں اور اسے چلانے والے کسی کے سیاسی حریف یا حلیف نہیں ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ ہمیں یہ حقیقت تسلیم کرنے میں بھی مزید تاخیر نہیں کرنی چاہئے کہ پارلیمانی نظام ہمیں بالکل راس نہیں آرہا۔ اس نظام حکومت کی لعنتیں کھل کر سامنے آگئی ہیں جس کے بعد واضح ہو گیا ہے کہ ہمارے لئے صدارتی نظام ہی موزوں ہے جو نظام خلافت

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ میں تدریج اور اس کے تقاضے

—— ڈاکٹر اسرار احمد ——

سب جانتے ہیں کہ یہ "معجزہ" تو پوری انسانی تاریخ میں ایک ہی بار رونما ہوا تھا کہ ایک ہی فرد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) نے دعوت کا آغاز بھی فرمایا' ابلاغ و تبلیغ اور نشر و اشاعت کے جملہ تقاضے بھی پورے کئے' پھر جن لوگوں نے دعوت کو قبول کیا انہیں نہ صرف جمع کیا بلکہ ایک نہایت مضبوط و محکم تنظیمی سلسلے میں منسلک کیا' پھر ان کا تزکیۂ نفس بھی کیا اور تعلیم و تربیت کے تمام تقاضے بھی پورے کئے' پھر اولاً عدم تشدد اور صبر محض' پھر اقدام اور چیلنج' اور بالآخر مسلح تصادم کے مراحل سے بھی گزارا' اور ہر مرحلے پر بنفسِ نفیس خود ہی قیادت اور رہنمائی فرمائی' حتیٰ کہ سپہ سالاری کے جملہ فرائض بھی ادا کئے'---اور کُل بیس برس کے عرصے میں یہ سارے مراحل طے کر کے لاکھوں مربع میل پر پھیلے ہوئے ملک میں انقلاب کی تکمیل فرمادی اور اللہ کے دین کو غالب کر دیا! (فصلی اللہ علیہ و آلہ وسلم)

اب ایک جانب تو اس حقیقت کو سامنے رکھئے' اور دوسری جانب اس امر کو کہ قرآن حکیم کے صغریٰ کبریٰ سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے' اور احادیثِ نبویہؐ میں تو صراحت کے ساتھ اس کی خبر دی گئی ہے کہ قیامت سے قبل ایک بار پھر اللہ کا دین اللہ کی زمین پر اسی شان کے ساتھ غالب ہو گا جس شان سے اب سے چودہ سو سال قبل ہوا تھا---اور اس بار یہ غلبۂ دین پورے کرۂ ارضی کو محیط ہو گا اور پورا عالمِ انسانی توحید کے نور سے بالفعل منور ہو جائے گا---بقول اقبال ؎

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہوجائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہوجائے گی!
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی!
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!!

چنانچہ مسند احمد بن حنبلؒ میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے اپنے مبارک زمانے سے قیامِ قیامت تک پانچ ادوار کا ذکر فرمایا ----یعنی (i) دورِ نبوتؐ (ii) دورِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ (iii) ظالم ملوکیت کا دور (iv) مجبوری والی بادشاہت (یعنی غلامی) کا دور----اور (v) دوبارہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور! ان میں سے چوتھے دور سے مراد غالباً مغربی امپیریلزم کا دور ہے جو براہ راست حکومت کے اعتبار سے تو ختم ہوچکا ہے مگر تاحال بالواسطہ اقتدار یعنی سیاسی و معاشی تسلط اور تہذیبی و ثقافتی غلبے کی صورت میں جاری ہے--- اس طرح اس وقت گویا نوعِ انسانی آنحضور ﷺ کے بیان کردہ ادوار کے اعتبار سے چوتھے اور پانچویں کے درمیان عبوری دور اور برزخی مرحلے میں ہے!

ادھر قرآن حکیم میں تین بار[1] تو یہ فرمایا گیا کہ:

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ

"وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق کے ساتھ تاکہ غالب کرے اسے کُل دین یا تمام ادیان پر"

۱۔ سورۃ التوبہ: ۳۳' سورۃ الفتح: ۲۸' سورۃ الصف: ۹

گویا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد "غلبۂ دینِ حق" ہے ---- اور دوسری طرف مختلف اسلوبوں سے تین ہی بار یہ فرمایا کہ آپؐ کی بعثت تمام نوعِ انسانی کے لئے ہے۔ جیسے مثلاً سورۂ سبا کی آیت ۲۸ میں فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا

"ہم نے نہیں بھیجا ہے آپؐ کو مگر تمام انسانوں کے لئے بشیر اور نذیر بنا کر!"

اب ان دونوں کو یعنی منطق کی اصطلاح میں "صغریٰ اور کبریٰ" کو جمع کرلیں تو صریح نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اب جب بھی دوبارہ "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کا دور دنیا میں آئے گا تو یہ خلافت عالمی اور آفاقی اور پورے عالمِ انسانی اور کرۂ ارضی کو محیط ہو گی۔

مزید برآں اس کی صریح پیشینگوئیاں بھی صحیح احادیث میں موجود ہیں۔ چنانچہ

(i) مسند احمد بن حنبلؒ ہی میں حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لَا یَبقٰی علٰی ظھرِ الارضِ بیتُ مدَرٍ وَلا وَبرٍ اِلَّا اَدخلہ اللّٰہُ کلمۃَ الاسلامِ' بعزِّ عزیزٍ و ذُلِّ ذلیلٍ 'اِمّا یُعزّھم اللّٰہ فیجعلھم مِن اھلِھا او یُذلّھم فیدینون لھا" قلتُ: "فَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ"

"روئے ارضی پر کوئی ایک گھر بھی ایسا نہیں بچے گا' خواہ وہ اینٹ گارے کا بنا ہوا ہو خواہ کمبلوں کے خیمے کی صورت میں ہو' جس میں اللہ کلمۂ اسلام کو داخل نہ کردے' خواہ کسی عزت والے کے اعزاز کے ساتھ' خواہ کسی پست ہمت کے ضعف کے ذریعے" (یعنی یا تو گھر والا خود ایمان لے آئے گا یا اسے اسلام کی بالادستی قبول کرنی ہو گی!) اس پر حضرت مقدادؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے دل میں کہا: "تب تو وہی بات پوری ہو جائے گی کہ ---- کل دین اللہ ہی کے لئے ہو جائے!" (اشارہ ہے سورۃ الانفال کی آیت ۳۹ کی جانب)

(ii) حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلمؒ میں روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے ارشاد فرمایا:

اِنّ اللّٰہ زَوٰی لی الارضَ فرأیتُ مشارقَھا و مغاربَھا' وانّ امّتی سیبلغ ملکُھا مازُوِیَ لی منھا

"اللہ تعالیٰ نے میرے لئے کل زمین کو لپیٹ دیا (یا سکیڑ دیا)۔ چنانچہ میں نے اس کے سب مشرق بھی دیکھ لئے اور تمام مغرب بھی۔ اور سن رکھو! کہ میری امت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہو کر رہے گی جو مجھے لپیٹ کر یا سکیڑ کر دکھادیئے گئے!"

لہٰذا قرآن پر ایمان اور صحیح احادیث پر یقین رکھنے والے کسی انسان کو ہرگز شک نہیں ہو سکتا کہ قیامت سے قبل پوری دنیا میں اسلام کا غلبہ بالکل اسی طرح ہو گا جس طرح آنحضور ﷺ کے دورِ مبارک میں ہوا تھا--- لیکن اس امر میں بھی ہرگز کسی شک کی گنجائش نہیں ہو سکتی کہ وہ "معجزہ" دوبارہ ہرگز رونما نہیں ہو سکتا کہ یہ مرحلہ کسی ایک ہی داعی کی دعوت اور انقلابی جدوجہد سے طے ہو جائے۔ اس لئے کہ اس معاملے میں "امتناعِ نظیر" یعنی آنحضور ﷺ کا بے مثل اور بے مثال ہونا آپ ﷺ پر ختم نبوت اور تکمیلِ رسالت کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے--- لہٰذا اب ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے' یعنی یہ کہ یہ مہم مرحلہ وار سر ہو اور پے بہ پے اور یکے بعد دیگرے ایسی "تحریکیں" اٹھیں جو اس کام کو درجہ بدرجہ بالکل اسی طرح آگے بڑھائیں جس طرح کا نقشہ سورۃ الانشقاق کی آیت ۱۹ میں سامنے آتا ہے' یعنی: "لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" ("تم لازماً ترقی کرو گے درجہ بدرجہ یا ایک ایک سیڑھی کر کے!") اور جس کی عام فہم تمثیل اولمپک ٹارچ سے دی جا سکتی ہے جسے ایک کھلاڑی لے کر دوڑتا ہے اور کچھ فاصلہ طے کر کے دوسرے کو تھما دیتا ہے' جو اسے کچھ دور اور لے جا کر تیسرے کے حوالے کر دیتا ہے--- اور اس طرح شمع آگے بڑھتی رہتی ہے!--- گویا وہ کام جو اس طرح چودہ سو سال قبل محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں اور جاں نثاروں رضی اللہ عنہم نے صرف ایک انسانی زندگی کے مختصر عرصہ میں کر

دکھایا تھا اب دوبارہ چار یا پانچ نسلوں میں بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے تو بہت بڑی کامیابی ہوگی!

اب اگر یہ بات درست ہے' اور یقیناً درست ہے' تو اس کے کچھ لازمی اور منطقی نتائج بھی ہیں جن کو اچھی طرح سمجھ بھی لینا چاہئے اور ذہنی اعتبار سے قبول بھی کر لینا چاہئے' ورنہ شدید بد دلی اور مایوسی کا سامنا ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہیں کہ:

(۱) اولین اور اہم ترین بات یہ کہ اس آخری داعی سے قبل جس کے ہاتھوں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچے گا' جتنے بھی ابتدائی یا درمیانی داعی آئیں گے ان کے فکر و فہم اور تصورات میں بھی کسی نہ کسی اعتبار سے نقص یا محدودیت ہو سکتی ہے' اور ان کے عزم و عزیمت' صبر و مصابرت اور ہمت و استقامت میں بھی مختلف پہلوؤں سے ضعف یا کمی ہو سکتی ہے۔ تب ہی تو وہ آخری کامیابی سے قبل ہی کسی مقام تک پہنچ کر بے دم اور بے حال ہو کر رہ جائیں گے یا "عجلت پسندی" کے باعث کسی "شارٹ کٹ" کے "دامِ ہمرنگِ زمین" میں پھنس کر رہ جائیں گے ---- لیکن ظاہر ہے کہ اگر وہ ع "میرا سب کچھ مرے خدا کا ہے!" کے مصداق اور "لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا" یعنی "اللہ کسی کو ذمہ دار نہیں ٹھہرائے گا مگر اس کی وسعت کے مطابق" (سورۃ البقرہ: ۲۸۶ اور چار مزید مقامات) کے قانونِ الٰہی کے مطابق اپنا سب کچھ اس کام میں لگا اور کھپا دیں گے تو چاہے دنیوی اعتبار سے بالفعل آخری منزلِ مراد یعنی غلبۂ دین تک نہ پہنچ پائیں عند اللہ سرخرو ہوں گے اور اخروی نجات و فلاح کے حقدار ہوں گے!

(۲) ان درمیانی یا عبوری "داعیوں" کے ساتھیوں اور اعوان و انصار میں سے بھی جہاں بہت سے لوگ ان داعیوں کی کم ہمتی کے باعث یا ع "کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی!" کی شکایت کی بنا پر علیحدگی اختیار کریں گے وہاں بہت سے خود اپنی کم ہمتی اور کم کوشی یا ذاتی تکبر اور حسد کی بنا پر بھی علیحدہ ہوں گے ---- اور پھر ان میں سے بھی بعض تو صرف عملی پسپائی کی راہ اختیار کرنے ہی پر اکتفاء کریں گے اور بعض زیادہ ذہین اور چالاک لوگ اپنی کم ہمتی کو چھپانے یا اپنے خبثِ باطن پر پردہ ڈالنے

کے لئے فکری اعتبار سے بھی "رجعتِ قہقریٰ" کا مظاہرہ کریں گے اور "انگور کھٹے ہیں" کی طرح اس انقلابی فکر ہی کو ناقابل اعتبار قرار دیں گے جس کی اساس پر جدّوجہد شروع کی گئی تھی۔ جبکہ اس کے برعکس حقیقت پسندی اور اولوالعزمی کا تقاضا یہ ہوگا کہ ان جملہ حقائق کو ذہن میں رکھتے ہوئے اور "گندم اگر بہم نہ شود بھس غنیمت است!" پر عمل کرتے ہوئے سفر کو جاری رکھا جائے اور اس پر تو غور و خوض مسلسل جاری رکھا جائے کہ ہم کسی غلطی کا ارتکاب تو نہیں کر رہے، یا ہم کہیں کوئی غلط موڑ تو نہیں مڑ آئے، لیکن صرف اپنی یا اپنے ساتھیوں کی "کم کوشی" کے باعث "مایوس" ہو کر کام سے دست کش نہ ہوا جائے (بقول اقبال۔ "مایوس نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ۔ کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی!") --- تاکہ حضرت یحییٰؑ کے ان الفاظ کے مطابق جو انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہے تھے کہ: "میں تو آنے والے کی راہ صاف کرنے والا ہوں!" ہر دو میانی داعی اور اس کے ساتھی اپنے بعد آنے والے کے لئے راہ بھی صاف تر کر دیں اور اس کے لئے کچھ نہ کچھ سازوسامان فراہم کر کے جائیں تاکہ اسے دوبارہ سارا کام از سرِنو ہی نہ شروع کرنا پڑے!

ان اصولی باتوں کو ذہن میں مستحضر رکھتے ہوئے اب حالیہ تاریخ پر نظر ڈالیے تو صاف نظر آجائے گا کہ بیسویں صدی عیسوی "احیائے اسلام" کی جدّوجہد کی صدی ہے۔ چنانچہ اس کے آغاز کے ساتھ ہی وہ عمل بھی شروع ہو گیا تھا جسے اسلام اور امّتِ مسلمہ کے "ہمہ جہتی احیائی عمل" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور جو اس صدی کے رُبعِ اول کے خاتمے کے بعد تو پوری شدت اختیار کر گیا تھا۔ اس "ہمہ جہتی احیائی عمل" کے دو محاذ نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے بالکل جدا تھے بلکہ ان کے تقاضے بعض اعتبارات سے ایک دوسرے سے متضاد بھی تھے ---- یعنی (۱) قومی اور عوامی محاذ---- جس پر مغربی استعمار سے نجات حاصل کرنے کے لئے آزادی کی تحریکیں برسرِعمل تھیں اور (۲) خالص احیائی محاذ---- جس پر "تجدید و احیائے دین" کا معرکہ گرم تھا۔

برِعظیم پاک و ہند میں اول الذکر محاذ مسلم لیگ نے سنبھالا جس کی تاسیس ۱۹۰۶ء میں ہوئی اور کُل اکتالیس برس کی جدوجہد کے ذریعے اس نے پاکستان قائم کر کے برعظیم پاک و ہند کے کم از کم دو تہائی مسلمانوں کو بیک وقت انگریزوں اور ہندوؤں دونوں کی غلامی سے نجات دلوا دی ---- جبکہ دوسرے محاذ پر پہلے "الہلال" اور "البلاغ" والے ابوالکلام آزاد اٹھے جنہوں نے ۱۹۱۳ء میں "حزب اللہ" قائم کی اور "حکومتِ الٰہیہ" کے قیام کی زوردار اذان دی لیکن ابھی لوگ جمع ہو ہی رہے تھے کہ بظاہر ذاتی "امامت" منعقد نہ ہونے کے باعث اور در حقیقت ان اسباب کی بناء پر جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے پوری بساط ہی لپیٹ کر رکھ دی ----اس کے کچھ عرصے بعد مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم "تجدید واحیائے دین" کے داعیے اور "الجہاد فی الاسلام" کے ولولے کے ساتھ سامنے آئے (واضح رہے کہ یہ دونوں مولانا کی دو شہرۂ آفاق تالیفات کے نام ہیں!) اور اس زوردار دعوت کے ساتھ "جماعت اسلامی" بھی قائم کر دی اور اس میں اپنی "امامت و امارت" بھی نصب کر دی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس "احیائی محاذ" پر گرانقدر کامیابیاں حاصل کیں اور نمایاں پیشقدمی کا مظاہرہ کیا---- لیکن ان سطور کے راقم کے نزدیک جماعت اسلامی بھی قیامِ پاکستان کے وقت "راہ بسیر" یعنی شارٹ کٹ کی بھول بھلیوں میں گم اور ملکی سیاست کی دلدل میں پھنس اور دھنس کر رہ گئی----اور اب ایک بار پھر ایسے باہمت لوگوں کی ضرورت ہے جو اس شمع کو تیسری نسل میں بھی نہ صرف یہ کہ روشن رکھیں بلکہ احیاءِ اسلام کی اس جدوجہد کو اور آگے بڑھانے کے لئے تن من دھن وقف کر دیں۔ اور یہ طرزِ عمل اختیار کریں کہ (بقول فیض)۔

یہ فصل امیدوں کی ہمدم، اس بار بھی غارت جائے گی
سب محنت صبحوں شاموں کی، اب کے بھی اکارت جائے گی
دھرتی کے کونوں کھدروں میں، پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو!
پھر مٹی سینچو اشکوں سے، پھر اگلی رُت کی فکر کرو!

پھر اگلی رُت کی فکر کرو' جب پھر اک بار اجڑنا ہے
اِک فصل پکی تو بھر پایا' تب تک تو یہی کچھ کرنا ہے!!

تقریباً پون صدی پر پھیلی ہوئی اس تاریخ میں اہم ترین اور جامع ترین شخصیت علامہ اقبال کی ہے۔ ان کے بارے میں جس قدر غور کیا جائے حیرت بڑھتی چلی جاتی ہے کہ ع "ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی!" چنانچہ ان کی یہ "جامعیت" حیرت انگیز ہے کہ وہ واحد رہنما ہیں جو بیک وقت قومی اور احیائی دونوں محاذوں پر اس درجہ سرگرم عمل رہے کہ اگر ایک جانب وہ فکرِ اسلامی کے "مجدد" ہیں ("الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیل جدید" ان کے خطبات کا عنوان ہے) تو دوسری جانب تصور پاکستان کے "خالق" اور نظریۂ پاکستان کے "موجد" بھی ہیں۔ اسی طرح وہ داعی الی القرآن بھی ہیں اور حکیم الاسلام بھی' اور اگرچہ "دعوت الی القرآن" کے میدان میں' اس کے باوجود کہ اس کا آغاز کرنے والے وہی تھے' بعد میں کچھ عرصہ زیادہ گھن گرج مولانا ابوالکلام کی سنائی دیتی رہی تھی --- تاہم جہاں تک قرآن کے فلسفہ و حکمت کے بحرِ عمیق میں غواصی کا تعلق ہے تو اس میدان میں تو وہ بالکل تنہا ہیں اور ان کا کوئی دوسرا شریک یا مثیل ہے ہی نہیں!

مزید برآں جس طرح ڈیڑھ دو صدی قبل شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی نگاہِ دوررس نے "ہند میں سرمایۂ ملت کی نگہبانی" کے لئے احمد شاہ ابدالی کا انتخاب کیا تھا اور اسے ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی' صرف اسی طرح نہیں بلکہ اس سے بھی کہیں بڑھ کر حضرت علامہ کی عقابی نگاہ نے ایک جانب لندن میں جا بسنے والے محمد علی جناح کو "قومی ناخدا" کی حیثیت سے معین کیا' اور خود انہیں اس پہلو سے "خود شناسی" کا جوہر عطا کیا' اور دوسری جانب حیدر آباد (دکن) میں مقیم ابوالاعلیٰ مودودی کو "متکلمِ اسلام" ہونے کا اہل سمجھا اور انہیں اس خطے میں منتقل ہونے کی دعوت دی جس کے بارے میں ان کی چشم باطن اور نگاہِ دوربین دیکھ چکی تھی کہ وہاں ایک آزاد مسلمان

... کا قیام "تقدیر الٰہی" ہے۔ (۱۹۳۰ء کا خطبہ الٰہ آباد)

تاہم امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہی کی طرح علامہ اقبال بھی بنیادی طور پر صرف مفکر اور "مصور" تھے اور عملی جدوجہد کے میدان میں اتر کر جماعت بنانے اور تحریک برپا کرنے کو ان کے مزاج سے کوئی مناسبت نہیں تھی۔ چنانچہ انہوں نے عملی کام جو بھی تھوڑا بہت کیا وہ صرف قومی محاذ پر کیا' (اور وہ بھی ثانوی حیثیت میں!) --- احیائی میدان میں عملی طور پر یا خیری برادران اور علامہ مشرقی اترے یا مولانا آزاد اور مولانا مودودی۔ ان میں سے بھی پہلے تین تو تاریخ کے اوراق اور ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو چکے ہیں' البتہ مولانا مودودی اس اعتبار سے زندہ ہیں کہ پاکستان اور بھارت ہی نہیں بنگلہ دیش اور کشمیر میں بھی ان کی قائم کردہ جماعت قائم اور موجود ہی نہیں فعال اور متحرک بھی ہے۔ باقی رہیں ان کی تصانیف اور تالیفات تو ان کا شہرہ تو پورے عالم اسلامی ہی نہیں پوری دنیا میں ہے!

اس وقت ہمیں اس امر سے بحث نہیں ہے کہ پاکستان یا بھارت میں مولانا مودودی کی قائم کردہ جماعت ۔ "کونسی وادی میں ہے' کونسی منزل میں ہے۔ عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں!" کے مصداق کہاں کہاں سے ہوتی ہوئی اب کس مقام پر ہے بلکہ صرف اس امرِ واقعی کا تذکرہ مقصود ہے کہ اس عرصے کے دوران جو لوگ اس قافلے سے علیحدہ ہوئے یا خارج کر دئے گئے ان میں سے اکثر تو جمود اور تعطل کا شکار ہو گئے یا کسی صرف علمی یا تعلیمی سرگرمی تک محدود ہو کر رہ گئے۔ بقیہ میں سے بھی بعض تو وہ ہیں جو اس کے بنیادی انقلابی فکر کو حرزِ جاں بنائے ہوئے اپنے فہم اور استعداد کے مطابق عملی جدّوجہد میں مصروف و مشغول ہیں جن میں سے ایک ان سطور کا راقم بھی ہے' ---- لیکن بعض وہ بھی ہیں جو اب اس بنیادی انقلابی فکر ہی کو غلط قرار دے رہے ہیں --- ان میں سے ایک نمایاں شخص بھارت میں ہیں یعنی مولانا وحید الدین خاں' جو بھارت کے سرکاری حلقوں اور بالخصوص بی جے پی اور آر ایس ایس کے منظورِ نظر ہیں' اور ایک پاکستان میں ہیں یعنی علامہ جاوید احمد غامدی جن کا خصوصی ہدف اس وقت یہ خاکسار اور اس کے نظریات ہیں۔

○ ○

بقیہ : پریس ریلیز

سے بھی قریب تر ہے۔ صدر کو پانچ سال کے لئے منتخب کر کے کام کا پورا موقع دے دیا جاتا ہے اور پھر مینڈکوں کے پھدک کر ایک پلڑے سے دوسرے پلڑے میں جانے سے صدر کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ انہوں نے کہا کہ ایک اور تدبیر کئے بغیر بھی اب کوئی چارہ نہیں رہا جو صوبوں کی نئی حد بندی سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اب تو ایک سیاستدان نے بھی 'جو قابل ذکر دانشور ہیں' اس تجویز کی حمایت کر دی ہے کہ ملک کو نئے صوبے بنا کر چھوٹے انتظامی یونٹوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ کوئی بڑا صوبہ ہی باقی نہ رہے جس سے چھوٹے صوبوں کو کوئی خوف ہو۔۔۔۔OO

KHALID TRADERS

IMPORTERS – INDENTORS – STOCKISTS & SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS, FROM SUPER – SMALL TO SUPER – LARGE

AUTHORIZED AGENTS NTN BEARINGS

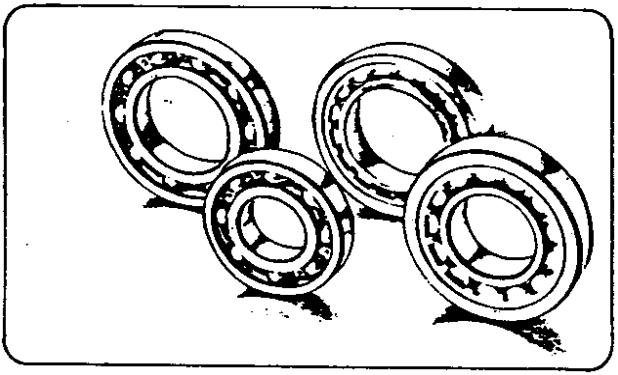

PLEASE CONTACT

TEL : 7732952-7735883-7730593
G.P.O. BOX NO. 1178, OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI-74200 (PAKISTAN)
TELEX : 24824 TARIQ PK CABLE : DIMAND BALL FAX : 7734776

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : Sind Bearing Agency 64 A-65, Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400 (Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : (Opening Shortly) — Amin Arcade 42, Brandreth Road, Lahore-54000 Ph : 54169

GUJRANWALA : — 1-Haider Shopping Centre, Circular Road, Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

نشری تقریر

ڈاکٹر اسرار احمد

اسلام کی دو سالانہ عیدیں

عید الفطر و عید الاضحیٰ

اور فقراء و مساکین کا لحاظ

عید الفطر اور عید الاضحیٰ دونوں عیدیں دو عظیم عبادات اور اسلام کے ارکانِ خمسہ میں سے دو اہم ارکان کے ساتھ ملحق ہیں۔ یعنی عید الفطر صومِ رمضان کے ساتھ اور عید الاضحیٰ حجِ بیت اللہ کے ساتھ ـــــ اور ان دونوں میں ایک طرف دوگانۂ شکرانہ مع اضافی تکبیرات اور نماز کے لیے جاتے اور آتے ہوئے غلغلۂ تکبیر بلند کرتے رہنا مشترک ہیں، جس کا حکم قرآن میں بھی موجود ہے، چنانچہ سورۃ البقرۃ میں صومِ رمضان سے متعلق آیت کا اختتام بھی ان الفاظِ مبارکہ پر ہوا کہ:ـــــ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ "اور تاکہ تم پوری کرو تعداد اور تکبیر کرو اللہ کی اس ہدایت پر جو اس نے تم کو دی اور تاکہ تم شکر کرو!" ـــــ اور سورۃ الحج میں فرمایا: كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ "اور اس طرح اس نے ان قربانی کے جانوروں کو تمہارے لیے مُسخّر کر دیا، تاکہ تم اللہ کی تکبیر کرو اس ہدایت پر جو اس نے تمہیں عطا فرمائی اور (اے نبی) بشارت سنا دیجئے احسان کی رَوِش اختیار کرنے والوں کو!" ـــــ اسی طرح دونوں عیدوں کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے غرباء و فقراء اور محتاجوں اور مسکینوں کے لیے خاص اہتمام رکھا ہے۔ عید الاضحیٰ کے موقع پر تو ظاہر ہے کہ یہ ضرورت قربانی کے گوشت کے ذریعے پوری ہو جاتی ہے۔ چنانچہ سورۃ الحج میں دو بار فرمایا کہ اس میں سے خود بھی کھاؤ اور غرباء و مساکین کو بھی کھلاؤ، چنانچہ پہلے فرمایا: "فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ

"کھاؤ اُس میں سے خود بھی اور کھلاؤ فاقہ کش فقیروں کو بھی" اور دوبارہ پھر فرمایا: "فَكُلُوا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ" یعنی کھاؤ اس میں سے خود بھی اور کھلاؤ ان قانع لوگوں کو بھی جو صاحبِ احتیاج ہونے کے باوجود صبر و قناعت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں ——— اور ان کو بھی جو بے تاب ہو کر دستِ سوال دراز کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

عید الفطر کے موقع پر اسی غرض کے تحت اسلام میں صدقۂ فطر کا حکم دیا گیا ہے تاکہ عید کی خوشیوں میں صاحبِ استطاعت لوگوں کے ساتھ غربا و مساکین بھی شامل ہو جائیں۔ یہ صدقہ ہر اُس مسلمان پر واجب ہے جو صاحبِ نصاب ہو، اور پھر اُس کو وسعت یہ دی گئی ہے کہ ایسا شخص صرف اپنی ہی طرف سے یہ صدقہ نہ کرے بلکہ اپنے زیرِ کفالت ہر ذی نفس کی جانب سے ادا کرے۔ یہاں تک کہ ایک بچہ اگر عین عید کی صبح کو تولد ہوا ہو تو اُس کی جانب سے بھی صدقۂ فطر ادا کرنا واجب ہے۔ صدقۂ فطر کا ذکر اگرچہ قرآن میں تو موجود نہیں ہے تاہم متعدد احادیثِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں اس کا ذکر نہایت وضاحت اور غایت درجہ تاکید کے ساتھ آیا ہے۔ مثلاً بخاری اور مسلم کی متفق علیہ روایت ہے کہ:

"عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی الله عنهما قال: فَرَضَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى الله عليه وسلم زَكٰوةَ الْفِطْرِ صَاعًا مِنْ تَمْرٍ اَوْ صَاعًا مِنْ شَعِيرٍ عَلَى الْعَبْدِ وَالْحُرِّ وَالذَّكَرِ وَالْاُنْثٰى وَالصَّغِيرِ وَالْكَبِيرِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ وَاَمَرَ بِهَا اَنْ تُؤَدّٰى قَبْلَ خُرُوجِ النَّاسِ اِلَى الصَّلٰوةِ۔"

"حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں سے ہر غلام اور آزاد اور ہر مرد اور عورت اور ہر چھوٹے اور بڑے پر صدقۂ فطر ——— ایک صاع کھجور یا ایک صاع جَو لازم کیا ہے، اور حکم دیا ہے کہ یہ صدقہ نمازِ عید کے لیے جانے سے پہلے ادا کر دیا جائے۔"

اس حدیث میں اگرچہ اس بات کی صراحت نہیں ہے کہ یہ صدقۂ فطر صرف صاحبِ نصاب پر واجب ہے، لیکن یہ بات اظہر من الشمس ہے اور عقلِ سلیم کے لیے اِس کا جاننا کچھ مشکل

نہیں، اس لیے اس کی صراحت نہیں کی گئی۔

کھجوروں اور جَو کی وضاحت اس لیے کی گئی کہ یہی اہلِ مدینہ کی عام خوراک تھی۔ اور ایک صاع کھجور یا ایک صاع جَو سے ایک متوسط افراد پر مشتمل کنبے کی ایک دن کی غذائی ضروریات کی کفالت ہو جاتی تھی۔ گویا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک صاحبِ نصاب شخص کے گھر میں اگر کُل افراد دس ہیں تو اُس کے صدقۂ فطر سے غریب مسلمانوں کے دس گھرانوں کی ایک دِن کی خوراک کا پورا انتظام ہو گیا۔ صاع کے تعین میں کسی قدر اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک وہ ہمارے اوزان کے اعتبار سے ساڑھے تین سیر کے لگ بھگ ہوتا ہے اور بعض کے نزدیک اس سے نصف، یعنی پونے دو سیر کے لگ بھگ۔ اِس کے تعین کے لیے لوگوں کو اپنے اپنے معتمد علیہ علماء کی طرف رجوع کرنا چاہیے، اور چونکہ ہمارے یہاں کی عام خوراک گندم ہے لہٰذا ساڑھے تین سیر یا پونے دو سیر گندم کی جو قیمت بازار میں ہو اُس کے حساب سے ہر ہر فردِ خانہ کی جانب سے صدقۂ فطر ادا کرنا چاہیے۔

صدقۂ فطر کی نمازِ عید کے لیے گھر سے روانگی سے قبل ادائیگی کی تاکید کی مصلحت بھی واضح ہے کہ اِس کا اصل مقصود ہی یہ ہے کہ غُرباء و مساکین بھی عید کی خوشیوں میں آسودگی کے ساتھ شریک ہو سکیں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی مسلمان آبادی میں لوگ عید کی خوشیاں منا رہے ہوں جبکہ اسی آبادی میں کوئی مسلمان گھرانہ فاقے سے ہو! صدقۂ فطر کی اس حکمت کو اس روایت میں بیان کیا گیا ہے جو سُننِ ابی داؤد میں وارد ہوئی ہے —— یعنی:

عَنِ ابْنِ عبّاس رضی اللہ عنہما قَالَ: فَرَضَ رَسُولُ اللہِ صَلَّی اللہ علیہ وسلم زَکٰوۃَ الْفِطْرِ طُهْرًا لِلصِّيَامِ مِنَ اللَّغْوِ وَالرَّفَثِ وَ طُعْمَةً لِلْمَسَاكِينِ؛

"حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے آپؓ نے فرمایا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقۂ فطر اس لیے واجب اور لازم کیا ہے کہ لوگوں کے روزے اگر فضول اور لایعنی گفتگو یا کسی فحش بات کے باعث آلودہ ہو گئے ہوں تو اس سے پاک ہو جائیں اور ساتھ ہی محتاجوں اور مسکینوں کے کھانے کا بندوبست ہو جائے۔"!

ان دونوں احادیث میں صدقۂ فطر کے لیے 'زکوٰۃ الفطر' کے الفاظ وارد ہوئے ہیں جس میں اصل اشارہ اسی جانب ہے کہ جس طرح فرض زکوٰۃ کا اصل حاصل بھی یہی ہے کہ لوگوں کے دلوں سے مال کی محبت کی نجاست کو دُور کر دے تاکہ لوگوں کی سیرتوں اور شخصیتوں کی تعمیر ان خطوط پر ہو سکے جو اُن کے خالق و مالک کو پسند ہیں، اسی طرح یہ 'زکوٰۃ الفطر' درحقیقت روزوں کو معصیت کی آلودگی سے پاک کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ البتہ جس طرح فرض زکوٰۃ اسلام کے معاشی نظامِ عدل و انصاف کا اہم رکن ہے اور اس کے ذریعے معاشرے کے ان لوگوں کی کفالت ہوتی ہے جو کسی سبب سے معاشی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہوں اور اپنے پاؤں پر نہ کھڑے ہو سکتے ہوں، اسی طرح زکوٰۃ الفطر سے عید کے روز مسلمانوں کی عام خوشی میں پسماندہ لوگوں کی شرکت و شمولیت کا مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے۔

اللہ ہمیں اوّلاً ماہِ صیام کی برکتوں سے کما حقّہٗ مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور اس مبارک مہینے کے اختتام پر عید کے روز صدقۂ فطر ادا کرنے کی توفیق بھی دے تاکہ ہمارے غریب بھائی عید کی خوشیوں میں ہمارے ساتھ شریک ہو سکیں۔ آمین ثم آمین۔

کون مسلمان ہے جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبّت کا دعویٰ نہ ہو!
لیکن آپؐ اور آپؐ کے لائے ہوئے دین سے سچی محبّت کے تقاضے کیا ہیں،
ہم میں اکثر لوگ اس سے بے خبر ہیں!

اس موضوع پر ڈاکٹر اسرار احمد کی نہایت جامع تالیف

حُبِّ رسولؐ اور اُس کے تقاضے

خود بھی مطالعہ کیجئے اور دوسروں تک بھی پہنچائیے!

صفحات ۳۲ ● قیمت -/۳ روپے

شائع کردہ
مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور

اسلام کے دو معاشی نظام

ڈاکٹر اسرار احمد

سماجی انصاف کے ضمن میں عہدِ حاضر میں معاشی عدل کی اہمیت اور اس سلسلے میں خاص طور پر پاکستانی معاشرے سے جاگیرداری، غیر حاضر زمینداری اور مزارعت کے خاتمے کی بحث چھڑ گئی ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معاشی اور اقتصادی معاملات کے بارے میں شریعتِ اسلامی کے احکام کی پشت پر جو بنیادی اصول کار فرما ہیں انہیں اچھی طرح سمجھ لیا جائے، تاکہ ان کے پس منظر میں شریعت کے احکام کی حکمتیں سامنے آسکیں اور ذہن و قلب میں انشراح پیدا ہو سکے۔

اسلام نے معاشی اور اقتصادی معاملات میں عدل و قسط کا جو مقام متعین کیا ہے، جس میں اس نے مساوات اور آزادی ایسی بظاہر متضاد اقدار کو نہایت خوبصورتی اور توازن سے سمو دیا ہے اس کے بارے میں یہ بات شاید اکثر لوگوں کو چونکا دے (اور یہی میں چاہتا ہوں تاکہ ذہن بیدار ہو جائیں) وہ یہ ہے کہ اسلام کا معاشی نظام ایک نہیں دو ہیں۔ اور دونوں اپنی اپنی جگہ از ابتدا تا انتہا مکمل ہیں۔ چنانچہ دونوں کا اپنا اپنا فلسفہ ہے، دونوں کا مختلف نظریۂ ملکیت، نظریۂ حقوق اور نظریۂ قدرِ زائد (Surplus Value) ہے اور ظاہر ہے کہ یہی چیزیں کسی معاشی نظام میں بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہ جملہ امور ان دونوں میں بالکل جدا جدا ہیں۔

اسلام کے ان دونوں معاشی نظاموں کو کوئی چاہے تو یوں کہہ لے کہ یہ دونوں ایک ہی نظام کے دو رخ ہیں لیکن بہرحال ان کے علیحدہ علیحدہ وجود سے انکار ممکن

نہیں۔ البتہ یہ دونوں نظام ایک دوسرے سے Interconnected (باہم مربوط) بھی ہیں اور بہت حد تک Interdependent بھی۔ اور اسلام کی اصل برکات اور اس کے جملہ ثمرات کا کامل ظہور ان دونوں کے اجتماع اور اتصال ہی سے ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اگر ان دونوں میں سے ایک پہلو نگاہوں سے اوجھل ہو جائے اور توجہ صرف دوسرے پر مرکوز ہو جائے تو اس سے جو تصویر سامنے آئے گی وہ اصل حقیقت سے بہت دور ہو گی۔ ان میں سے ایک اسلام کا روحانی و اخلاقی نظام ہے اور دوسرا قانونی و فقہی نظام۔ اور ان دونوں کے تقاضے بسا اوقات مختلف ہی نہیں متضاد ہوتے ہیں۔ تاہم ان دونوں کے امتزاج سے اسلام کا کامل نظام وجود میں آتا ہے۔ آپ چاہیں تو ان دونوں پہلوؤں کو "دعویٰ" (Thesis) اور "جوابِ دعویٰ" (Anti-Thesis) سے تعبیر فرمالیں اور اسلام کے مجموعی اقتصادی نظام کو ان دونوں کا امتزاج (synthesis) قرار دے لیں۔

اسلام کی قانونی اور اخلاقی تعلیمات کے مابین جو فرق و تفاوت بہت سے معاملات میں موجود ہے' وہ ایک چھوٹی اور سادہ سی مثال سے واضح ہو جائے گا۔ فرض کیجئے کہ کوئی شخص آپ کے ایک تھپڑ مار دے تو اگر آپ بالکل ہی عاجز و کمزور ہوں تو اس صورت میں تو ظاہر ہے کہ "قہرِ درویش برجانِ درویش" کے سوا اور کوئی صورت قابلِ عمل ہے ہی نہیں۔ لیکن اگر آپ بدلہ لینے پر قادر ہوں تو آپ کے سامنے دو راستے کھلے ہوں گے: ایک یہ کہ آپ بدلہ لے لیں اور دوسرے یہ کہ آپ معاف کر دیں۔ اس صورت میں ایک جانب اسلام کا قانونی اور فقہی نظام ہے جو بدلے اور قصاص کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم فرماتا ہے: "وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ" یعنی "اے ہوشمندو! تمہارے لئے قصاص ہی میں زندگی ہے!" (البقرہ:۱۷۹) لیکن دوسری طرف اسلام کا اخلاقی اور روحانی نظام ہے جو عفو و درگزر کی تلقین کرتا ہے۔ یعنی اگر معاف کر دو تو یہ تقویٰ اور خدا ترسی سے قریب تر ہے۔ چنانچہ کہیں تو شوق اور رغبت دلانے کے انداز میں فرمایا جاتا ہے:

"وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ" یعنی "وہ لوگ جو غصہ کو پی جائیں اور لوگوں کو معاف کر دیا کریں۔" (آل عمران: ۱۳۴) اور کہیں اس سے بھی زیادہ زوردار الفاظ میں ترغیب دی جاتی ہے کہ "وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" یعنی "اگر تم معاف کر دیا کرو، اور چشم پوشی سے کام لو، اور خطائیں بخش دیا کرو تو یقیناً اللہ بھی غفور اور رحیم ہے!" (التغابن: ۱۴) — دیکھ لیجئے کہ عفو و قصاص ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ انسانی معاشرہ ان دونوں میں سے صرف ایک پر استوار ہو سکتا ہے۔ دونوں اپنے اپنے مقام پر لازم و ناگزیر ہیں اور حسنِ معاشرت ان دونوں کے امتزاج ہی سے وجود میں آتا ہے۔

اس پر قیاس کر کے سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام کے معاشی نظام کے بھی دو پہلو ہیں، چنانچہ ایک جانب قانونی اور فقہی نظام معیشت ہے جس کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ یہ ایک نوع کی محدود (Controlled) اور داخلی طور پر منضبط (Internally managed) سرمایہ داری (Capitalism) ہے، اس لئے کہ اس میں انفرادی سرمایہ کاری کی اجازت موجود ہے، اگرچہ اسے "سرمایہ دارانہ نظام" بننے سے بعض تحدیدی اقدامات نے روک دیا ہے۔ دوسری طرف اسلام کا روحانی و اخلاقی نظام معیشت ہے جس کے بارے میں میں پورے انشراحِ صدر سے عرض کرتا ہوں کہ وہ ایک نہایت اعلیٰ قسم کی روحانی اشتراکیت (Spiritual Socialism) ہے اور ایک ایسا کامل سوشلزم ہے کہ اس سے بلند تر سوشلزم کا تصور ممکن ہی نہیں۔ اس لئے کہ سوشلزم یا کمیونزم میں تو پھر بھی انسانی ملکیت کا اثبات موجود ہے، اگرچہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی، لیکن اسلام اپنی اخلاقی و روحانی اور صحیح تر الفاظ میں "ایمانی تعلیم" کی رُو سے انسانی ملکیت کی کلی نفی کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں بار بار یہ الفاظ آتے ہیں کہ "لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" یعنی "آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس سب کا مالک صرف اللہ

ہے"۔ چنانچہ انسان کسی اور شے کا مالک تو کیا ہو گا' خواہ وہ زمین ہو یا مکان' اور سازوسامان ہو یا روپیہ پیسہ' وہ تو خود اپنا اور اپنے وجود کا مالک بھی نہیں' اس کے ہاتھ پاؤں' اعضاء و جوارح اور جسم و جان اور اس کی کُل صلاحیتیں اور توانائیاں سب اللہ کی ملکیت ہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں ان کا امین ہوں۔ بقول شیخ سعدیؒ ؎

ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست
حقیقت مالکِ ہر شے خداست

یا بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست
ایں متاعِ بندہ و مِلکِ خداست

اس اعتبار سے ہمارے ہاں بڑا کنفیوژن پایا جاتا ہے۔ سوشلسٹ ذہن رکھنے والے اہلِ قلم متذکرہ بالا مضمون کی آیات اور احادیث کو اکٹھا کر کے ہر شے کی ملکیت کی بھی کامل نفی کرتے رہے ہیں اور ضرورت سے زائد اپنے پاس رکھنے کی بھی' کہ جب "قُلِ الْعَفْو" فرما دیا گیا یعنی جتنا ضرورت سے زائد ہے اللہ کی راہ میں دے ڈالو (البقرہ:۲۱۹) تو زائد چیز جبراً بھی وصول کر لی جائے گی۔ اس طرح وہ ایک کامل اسلامی سوشلزم کا نقشہ پیش کرتے رہے جب کہ وہ دوسرے پہلو کو بالکل نظر انداز کرتے رہے۔ حالانکہ قانونِ وراثت بھی اسی قرآن میں موجود ہے' اور حضور اکرم ﷺ نے جو نظام برپا کیا تھا اس میں کہیں جبری مساوات دکھائی نہیں دیتی۔ بلکہ اس کے برعکس آزاد معیشت کے مواقع دیئے گئے تھے' کہ محنت کرو اور جائز ذرائع سے کماؤ' اور ان ذرائع سے تم جو کچھ کماؤ گے اس پر تمہارا حقِ تصرف یہاں تک تسلیم کیا جائے گا کہ اس کو وراثت میں منتقل بھی کیا جا سکے۔ دوسری طرف ہمارے ہاں بعض مفکرین اور اصحابِ قلم نے صرف اس قانونی نظام کو اتنا نمایاں کیا ہے کہ دوسرا پہلو دب کر رہ گیا ہے۔ یعنی "قُلِ الْعَفْو" کی آیت ان کی تقریر و تحریر میں آتی ہی نہیں!

یاد رہے کہ یہ کنفیوژن (الجھن) پورے خلوص کے ساتھ محض غلط فہمی کی بنیاد پر بھی ہو سکتی ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ یہ غلط فہمی ہمارے دورِ اول یعنی خلافتِ راشدہ کے دوران بھی پیدا ہو گئی تھی' چنانچہ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ نے غلبۂ زہد کے باعث یہ رائے قائم کرلی تھی کہ ضرورت سے زائد اشیائے صرف اور کسی بھی مقدار میں سونا اور چاندی اپنے پاس رکھنے کی قطعاً اجازت نہیں۔ گویا آپؓ نے آیۂ کنز یعنی سورۃ التوبہ کی آیت ۳۴:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

"جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دیجئے!"

کو بالکل اس کے ظاہری الفاظ پر محمول کیا۔ چنانچہ خلافتِ راشدہ کے اس نظام میں جس پر تمام اُمّت جمع تھی' اس رائے کو ایک انتہاپسندانہ موقف قرار دیا گیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں انہیں مدینہ منورہ سے باہر چلے جانے کی ہدایت بھی کی گئی۔ لہٰذا انھوں نے ایک بیابان میں جھونپڑا ڈالا اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کے احساس کی شدت کا یہ عالم تھا کہ وفات کے قریب آپؓ نے اپنی زوجہ محترمہ سے فرمایا کہ "میرے خلیل (یعنی نبی اکرم ﷺ) نے فرمایا تھا کہ مسلمانو تم اپنے اردگرد سانپ بچھو (یعنی سامانِ تعیش) جمع کرلو گے۔ افسوس کہ ہم نے بھی سانپ اور بچھو اپنے گرد جمع کر لیے ہیں۔" تو انھوں نے کہا کہ کہاں ہیں وہ سانپ اور بچھو؟ تو آپؓ نے معمولی چیزوں جیسے توا' چمٹا اور دیگچی کا حوالہ دے کر کہا: یہ نہیں پڑے ہوئے میرے گرد! حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کے اسی غلبۂ زہد کی وجہ سے آنحضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ "تم میں سے جو چاہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا زہد اپنی آنکھوں سے دیکھے تو اسے چاہئے کہ وہ میرے دوست ابو ذرؓ کو دیکھ لے"۔ بہرحال یہ نظام اسلامی کا وہ روحانی پہلو ہے جس کی طرف اسلام انسانوں کو ترغیب تو دینا چاہتا ہے کہ یہی وہ

راستہ ہے جس کے ذریعے انسان اپنے تزکیہ اور روحانی مراتب کے حصول کے لئے آگے بڑھ سکتا ہے' مگر اس کو قانونی درجہ دے دینا ایک مغالطہ تھا جو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو پورے خلوص اور اخلاص کے ساتھ لاحق ہوا۔ لیکن عہدِ حاضر میں یہ مغالطہ جان بوجھ کر اور بدنیتی کے ساتھ دیا جا تا رہا ہے کیونکہ آج تو خلافتِ راشدہ کا نظام پورے کا پورا ہمارے علم میں موجود ہے اور امت کے اس اجماعی فیصلے کو بغیر بدنیتی کے نظرانداز کرنا ممکن نہیں ہے۔

بہرحال اسلام کے اس روحانی معاشی نظام کے چار اصول ذہن میں اچھی طرح مرتب اور مستحضر کرلئے جائیں:

۱) انسانی ملکیت کی کُلی نفی۔

۲) یہ یقین کہ انسان کو اس دنیا میں جو کچھ ملتا ہے اس کی کمائی نہیں اللہ کا فضل ہے۔ گو دکان پر وہ بیٹھا ہے' کھیت میں ہل اس نے چلایا ہے' محنت اس نے کی ہے' لیکن ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ ملا ہے اس کو اللہ کا عطیہ اور اس کا فضل سمجھو۔ اگر اسے اپنی محنت کا ثمرہ سمجھو گے تو اس پر اپنا حقِ ملکیت جتاؤ گے اور اس کا منطقی نتیجہ یہ ہو گا کہ تم بھی وہی سمجھو گے جو قومِ شعیبؑ نے سمجھا تھا کہ: "اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا" یعنی یہ کہ ہمیں اختیار ہونا چاہئے کہ اپنے مال میں جیسے چاہیں تصرف کریں (ہود: ۸۷) لیکن اگر اللہ کا فضل سمجھو گے تو اس میں تصرف بھی اصل مالک اور عطاکنندہ کی مرضی کے مطابق کرو گے۔

۳) اللہ کے اس "فضل" میں سے انسان کا جائز حق صرف اس کی ضروریات کے بقدر ہے' اور ان بنیادی انسانی ضرورتوں کو بھی بعض احادیث میں متعین کر دیا گیا ہے۔ یعنی:

الف : اگر دو وقت کھانے کے لئے مل گیا ہے۔

ب : سر چھپانے کے لئے اگر کوئی چھت موجود ہے۔

ج : پہننے کے لئے اگر دو جوڑے کپڑوں کے موجود ہیں۔ اور

د : اپنے کردار، اخلاق اور عفت کی حفاظت کے لئے اگر ایک بیوی بھی موجود ہے۔ تو تمہارا بنیادی حق تمہیں مل گیا۔

۴) اس بنیادی ضرورت سے زائد جو کچھ ہے اس کے بارے میں اخلاقی یا روحانی سطح پر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ وہ خواہ قانونی اعتبار سے تمہارا ہو، حقیقت کے اعتبار سے تمہارا نہیں، دوسروں کا حق ہے۔ اس کو ان لوگوں تک پہنچادو جن کے پاس بنیادی ضرورت کے بقدر بھی موجود نہیں ہے اور پھر سمجھو کہ تم غریبوں کی اس امانت کے بوجھ سے سبکدوش ہو گئے جو تمہارے امتحان کی غرض سے تمہارے مال میں شامل کردی گئی تھی۔

الغرض، یہ ہے وہ مقام جہاں "قُلِ الْعَفْوَ" کا فلسفہ بندۂ مومن کو پہنچانا چاہتا ہے، یعنی یہ کہ تمہارے پاس جو بھی "قدرِ زائد" ہے اس کو مزید کمائی کا ذریعہ نہ بناؤ۔ تمہاری ضرورت پوری ہو گئی تو تمہارا حق مکمل ہو گیا، اب جو زائد تمہارے پاس ہے وہ خواہ قانوناً تمہارا ہو مگر حقیقتاً تمہارا نہیں ہے۔

بہرحال یہ ایک مکمل معاشی نظام ہے۔ اس میں ملکیت اور قدر زائد کا اپنا جداگانہ تصور ہے، اور اس قدر زائد کا مصرف بھی طے شدہ ہے۔ اور سب جانتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے خود اسی نظام کے مطابق زندگی بسر کی تھی۔ چنانچہ یہ بات بہت سے لوگوں کے لئے جنہوں نے اس سے قبل ان معاملات پر غور نہ کیا ہو بہت حیران کن ہو گی کہ نبی اکرم ﷺ نے تمام عمر "زکوٰۃ" ادا نہیں کی۔ اس لئے کہ زکوٰۃ تو ظاہر ہے کہ صرف صاحبِ نصاب پر عائد ہوتی ہے اور آپؐ نے کبھی کوئی درہم و دینار اپنے پاس رکھا ہی نہیں کہ اس کی نوبت آسکتی۔ لیکن یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ اس نظام کی ساری خوبی اور اس کا کُل حسن اس کے "رضاکارانہ" (Voluntary) ہونے میں مضمر ہے۔ اسے کسی ادنیٰ درجہ میں بھی بالجبر نافذ کرنے کی کوشش کی جائے گی تو نتیجہ وہی نکلے گا جو کمیونزم کے حشر کی صورت میں سامنے آچکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں ہمیں دونوں طرح کے حضرات نظر آتے

ہیں۔ وہ بھی جنہیں عرفِ عام میں فقراء صحابہ کہا جاتا ہے جنہوں نے اسی "اختیاری فقر" کے نظام کو عملاً اختیار کیا جن کے سرخیل حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ تھے' اور وہ بھی ہیں جنہوں نے اپنا عام چلن تو اسلام کے قانونی اور فقہی نظام کے مطابق رکھا جس سے ان کے پاس سرمایہ جمع بھی ہوا لیکن جب بھی جہاد اور قتال فی سبیل اللہ کے لئے ضرورت پیش آئی انہوں نے اپنا مال حاضر کر دیا۔ دورِ صحابہؓ کے بعد اسی "اختیاری فقر" اور "رضاکارانہ سوشلزم" پر صوفیائے کرام کا عمل رہا۔ اور کون نہیں جانتا کہ دور صحابہؓ کے بعد اسلام کی تبلیغ و توسیع کا سارا معاملہ ان ہی حضرات کی مساعی کا مرہونِ منت ہے۔

قرآن حکیم کے فلسفہ و حکمت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایمانی اور روحانی سطح پر قرآن کی معاشی تعلیمات پر غور و فکر کے ضمن میں سورۃ الروم کی آیت ۳۹ بہت توجہ اور غور کے قابل ہے جس میں "ربا" (سود) کا ذکر بمقابلہ صدقات آیا ہے:

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ○

"اور جو تم دیتے ہو سود پر کہ بڑھتا رہے لوگوں کے مال میں سو وہ نہیں بڑھتا اللہ کے یہاں' اور جو دیتے ہو زکوٰۃ سے اللہ کی رضامندی چاہتے ہوئے سو یہ وہی ہیں جو (اپنے مال کو) بڑھانے والے ہیں۔"

گویا دین کی روحانی تعلیم کے اعتبار سے "ربا" درحقیقت صدقہ اور خیرات کے بالمقابل ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کہیں ملازم ہے اور اس کو ماہانہ تنخواہ ملتی ہے جس سے اس کی ضروریات پوری ہو رہی ہیں لیکن کچھ اضافی سرمایہ اس کے پاس جمع ہو گیا ہے۔ اس فاضل سرمایہ کے دو مصرف ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کو کسی اور کے کاروبار میں لگا کر اس کی محنت کے بل بوتے پر اس سرمایہ کو بڑھائے (وہ خود تو محنت نہیں کرے گا کیونکہ وہ تو کسی اور جگہ ملازم ہے) تو اگرچہ یہ قانونی اور فقہی سطح پر جائز

اور درست ہے لیکن روحانی سطح پر یہ بھی "ربا" ہی قرار پائے گا کیونکہ اس روحانی اور اخلاقی سطح پر اس فاضل سرمائے کا صحیح مصرف یہ ہے کہ اول تو اس کا مالک ہی محتاجوں اور غریبوں کو بنا دیا جائے یعنی ایسے لوگوں کو دے دیا جائے جو محروم ہیں یا جن کے پاس کاروبار کے لئے بنیادی سرمایہ موجود نہیں ہے یا بدرجۂ آخر "قرضِ حسن" کی صورت میں دے دیا جائے تاکہ وہ اس کے ذریعے اپنا کاروبار چلا کر اسے واپس لوٹا دیں۔ اس سے آگے بڑھ کر فاضل سرمائے کو مزید آمدنی کا ذریعہ بنانا قانونی سطح پر تو جائز ہو سکتا ہے مگر روحانی اور اخلاقی سطح پر یہ چیز بھی ممنوعات کی فہرست میں داخل ہے۔

اسلام کا قانونی نظام معیشت

اخلاقی اور روحانی، یا قرآن و حدیث کی مخصوص اصطلاح میں ایمانی اور احسانی سطح پر اسلام کی معاشی تعلیمات کے ضمن میں دو امور تو اس سے قبل واضح کئے جا چکے ہیں، یعنی:

(I) ایک یہ کہ یہ ایک مکمل معاشی نظریہ اور نظام ہے جس کے چار بنیادی اصول یہ ہیں کہ (i) اس پوری کائنات میں ملکیت کا کامل اور مطلق حق صرف اللہ کو حاصل ہے، انسان کو یہ حق نہ انفرادی سطح پر حاصل ہے نہ اجتماعی یا قومی سطح پر، بلکہ انسان کو صرف حقِ "امانت" حاصل ہے۔ (ii) اس دنیا میں کسی انسان کو جو کچھ ملتا ہے، خواہ اس کے لئے اس نے خود شدید محنت کی ہو اور مشقت جھیلی ہو، وہ اس کی "کمائی" نہیں بلکہ اللہ کا "فضل" ہے۔ (iii) اس فضلِ خداوندی میں سے انسان کا جائز حق صرف اس کی "ضروریات" کی حد تک ہے۔ (iv) اس سے زائد جو کچھ ہے وہ اس کا نہیں، بلکہ حقیقت میں فقراء اور مساکین یا سائلین اور محرومین کا حق ہے جو اس کے مال میں صرف اس امتحان کی غرض سے شامل کر دیا گیا ہے کہ دیکھیں کہ آیا وہ پوری امانتداری کے ساتھ اصل حقداروں کو ان کا حق پہنچا کر سبکدوش اور سرخ رو ہو جاتا ہے یا اس پر اپنے "قبضۂ مخالفانہ" کے ذریعے اپنے آپ کو اخلاق کی بالیدگی اور روحانی

ترفع سے محروم کرلیتا ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ نبی اکرم ﷺ اور بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسی "اختیاری فقر" کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ اور دورِ صحابہؓ کے بعد اولیاء اللہ اور صوفیائے کرامؒ نے بھی ع "مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے!" کے مصداق اسی سطح پر زندگیاں بسر کیں۔ البتہ یہ واضح رہنا چاہئے کہ یہ معاملہ خالص اختیاری (VOLUNTARY) ہے۔ اور اس میں قانونی یا ریاستی جبر کا ادنیٰ شائبہ بھی شامل ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ اس کا اصل "حسن" ختم ہو جائے گا بلکہ اس کا بنیادی مقصد ہی فوت ہو کر رہ جائے گا۔

ان دو امور پر ایک تیسری حقیقت کا اضافہ کرلیا جائے۔ اور وہ یہ کہ اگرچہ اس سطح پر زندگی بسر کرنا بلاشبہ ایک نہایت اقلِ قلیل اقلیت ہی کے لئے ممکن ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر کسی معاشرے میں لاکھوں میں سے ایک شخص بھی اس سطح پر زندگی گزار رہا ہو تو ایسے لوگ اس معاشرے میں اخلاقی اور روحانی اقدار کے زندہ اور برقرار رکھنے کا مؤثر ذریعہ بن جاتے ہیں اور انہیں گویا اس معاشرے میں ایک قسم کے اخلاقی و روحانی "PACE-MAKERS" کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ عوام الناس میں ہر دلعزیزی اور مقبولیت انہیں حاصل ہوتی ہے نہ کہ اصحابِ دولت اور اربابِ اقتدار کو۔ اور حقیقی معنی میں تعظیم اور تکریم ان کی ہوتی ہے نہ کہ صاحبانِ تخت و تاج اور اصحابِ دولت و ثروت کی۔ بلکہ بسا اوقات بڑے بڑے شہنشاہ اور کج کلاہ ان خرقہ پوش اور بوریا نشین فقیروں کے در پر حاضری کو اپنے لئے موجبِ سعادت سمجھتے ہیں۔ جیسے کہ بالکل صحیح فرمایا علامہ اقبال نے کہ ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں، یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!

چنانچہ نہایت مشہور واقعہ ہے کہ حج کے موقع پر لوگوں کا رجوعِ عام اور خلقت کا اژدھام ایک صاحبِ علم و فضل کے گرد دیکھ کر ہارون الرشید جیسے عظیم حکمران سے

اس کی محبوب بیگم ملکہ زبیدہ نے کہا تھا: "اصل حکومت تو ان کی ہے' نہ کہ تمہاری!" — پھر چند سو سال بعد کا واقعہ ہے کہ برِّعظیم ہند کے پایۂ تخت دہلی میں طویل عرصے تک دو متوازی حکومتیں قائم رہیں' ایک سیاسی اور عسکری حکومت' اور دوسری اخلاقی اور روحانی حکومت' اور مؤخرالذکر حکومت کے ایک "تاجدار" سلطان الہند حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے "عہدِ حکومت" کے دوران چھ یا سات بادشاہ سیاسی اور عسکری حکومت کے تخت پر بیٹھے' لیکن نہ صرف یہ کہ حضرت نظام الدینؒ نے کبھی کسی بادشاہ کے دربار میں حاضری نہیں دی' بلکہ بعض کی شدید خواہش کے باوجود انہیں اپنے یہاں حاضر ہونے کی اجازت بھی مرحمت نہیں فرمائی!— اور یہ تو بالکل ماضی قریب کا واقعہ ہے کہ گزشتہ صدی کے دوران سلسلہ مجددیہ نقشبندیہ کے بزرگ حضرت شاہ غلام علیؒ نے ریاست ٹونک کے والی نواب امیر خان کی جانب سے خانقاہ کے مصارف کے لئے ایک جاگیر کا وثیقہ اس کی پشت پر یہ شعر لکھ کر واپس کر دیا تھا کہ۔

ما آبروئے فقر و قناعت نہ باختیم
با میر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است

یعنی "ہم یہ جاگیر قبول کر کے اپنے فقر اور درویشی کی عزت و آبرو کا سودا کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ امیر خان سے کہہ دیا جائے کہ ہماری روزی ہمارے پروردگار کی جانب سے مقرر ہے!"

چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ آج ہم قومی سطح پر اخلاق کے جس خوفناک زوال' اور روحانیت کے جس شدید فقدان سے دوچار ہیں اس کا ایک اہم سبب یہی ہے کہ آج لاکھوں کیا کروڑوں میں بھی کوئی ایک انسان اس سطح پر زندگی گزارتا نظر نہیں آتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں عزت و احترام کی بنیاد صرف دولت و ثروت اور حکومت و اقتدار بن کر رہ گئے ہیں۔ حالانکہ لوگوں کو خوب معلوم ہوتا ہے کہ یہ دولت حرام اور ناجائز ذرائع سے کمائی گئی ہے' اور یہ اقتدار بھی "دھن' دھونس' اور دھاندلی" کے ذریعے حاصل کیا گیا ہے!

اور اب آیئے قانونی اور فقہی سطح پر اسلام کی معاشی تعلیمات کی جانب! جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جاچکا ہے، قانونی سطح پر اسلام کا معاشی نظام ایک محدود اور مقید (CONTROLLED) اور اندرونی طور پر منضبط (INTERNALLY MANAGED) سرمایہ دارانہ معیشت (CAPITALISM) کی حیثیت رکھتا ہے۔

تو آیئے کہ سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ یہ "کیپٹلزم" سے کیوں اور کیسے مشابہ ہے؟ یہ بنیادی طور پر کیپٹلزم سے اس لئے مشابہ ہے کہ اس میں وہ چاروں بنیادی اوصاف موجود ہیں جو مغرب کے سرمایہ دارانہ معاشی نظام میں بھی موجود ہیں۔ اور در حقیقت ان ہی کی بنیاد پر اسے کمیونزم پر وہ فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی ہے جس کا جشن آج پوری مغربی دنیا اور خصوصاً اس کے امام اور قائد امریکہ میں جوش و خروش کے ساتھ منایا جارہا ہے۔ اس لئے کہ ان اوصاف کے ذریعے ایک جانب انسان کی بعض حیوانی جبلتوں کو بھرپور تسکین حاصل ہو جاتی ہے تو دوسری جانب ایک مسلسل مقابلے اور مسابقت کا بازار گرم رہتا ہے، جس کے باعث معاشی میدان میں تیز رفتاری اور حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور ہر نوع کی پیداوار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ چار بنیادی اوصاف حسب ذیل ہیں:

(۱) جملہ عملی اور قانونی تقاضوں کے اعتبار سے ذاتی اور نجی ملکیت (PRIVATE OWNERSHIP) کا اثبات، جو صرف اشیائے صَرف یعنی استعمال کی چیزوں ہی پر نہیں، جملہ ذرائع پیداوار، جیسے کھیت، دکان اور کارخانہ، پر بھی حاوی ہے۔

(۲) ذاتی منفعت اور شخصی مفاد کے باعث اضافی محنت و مشقت، اور زیادہ جان مار کر کام کرنے کا جذبہ، یعنی ذاتی حوصلہ مندی (PERSONAL INCENTIVE) جس سے پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔ پھر اس پر مستزاد کھلا مقابلہ اور آزادانہ مسابقت

(OPEN COMPETITION) جس سے نفع کی شرح خود بخود کم ہو جاتی ہے اور صارفین کو فائدہ پہنچتا ہے۔

(۳) اشیاء کی قیمتوں کے تعین میں کسی مصنوعی کنٹرول کی بجائے طلب (DEMAND) اور رسد (SUPPLY) کے عوامل کا آزادانہ بروئے کار آنا، یعنی "منڈی کی معیشت" (MARKET ECONOMY) کا اصول!

(۴) اسی طرح اجری اور مستاجری یعنی کارکنوں کی مزدوری اور ملازمت کے معاملات میں بھی مصنوعی پابندیوں اور قدغنوں سے اجتناب۔ اور ملازم رکھنے والوں (EMPLOYERS) کے لئے "رکھنے یا فارغ کر دینے" کی کھلی آزادی، یعنی "HIRE AND FIRE" کا آزادانہ اختیار۔ (بشرطیکہ اس کے ساتھ "بے روزگار" لوگوں کے لئے ریاستی کفالت کی ضمانت موجود ہو!)

جیسے کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، ان چاروں چیزوں کا نہایت گہرا تعلق انسان کی حیوانی جبلتوں کے ساتھ ہے۔ اور یہ انسانی سرشت کے ساتھ کامل مطابقت رکھتی ہیں۔ چنانچہ ان ہی کو نظر انداز کر کے کیمونزم نے گویا اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھودی ہے۔ اور ان ہی کے باعث مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کو وہ فتح حاصل ہوئی ہے جس پر وہ بغلیں بجا رہا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ بعض دوسرے اعتبارات سے مغرب کی سرمایہ دارانہ معیشت نہایت ظالمانہ اور حد درجہ استحصالی مزاج کی حامل ہے۔ چنانچہ کیمونزم کا ظہور بذاتِ خود سرمایہ دارانہ نظام کے اسی ظلم اور استحصال کے خلاف "ردِّ عمل" کی حیثیت رکھتا تھا جو ع "انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات!" کے مصداق ردِّ عمل کی طبعی و فطری انتہاپسندی کی بنا پر شکست کھا گیا۔ اس لئے کہ اس نے اپنی اس انتہاپسندی کے باعث انسان کی حیوانی جبلتوں کو نظر انداز کر دیا۔

بہرحال اسلام کے قانونی نظام معیشت میں یہ چاروں اصول بہ تمام و کمال موجود ہیں جن کی بناء پر اسے مغرب کی سرمایہ دارانہ معیشت کے ساتھ ایک گونہ مماثلت حاصل ہے!

اب ہماری اصل گفتگو تو شریعتِ اسلامی کے ان احکام اور اقدامات کے بارے میں ہوگی جن کی بنا پر ہم اسلام کے قانونی نظام معیشت کو "محدود اور مقید" سرمایہ دارانہ معیشت قرار دیتے ہیں اور جن کا اصل مصرف اور بنیادی مقصد یہ ہے کہ معیشت کے میدان میں "سرمایہ کاری" کی فضا تو بھرپور طور پر برقرار رہے' لیکن "سرمایہ" استحصال کا آلہ نہ بن جائے' اور "سرمایہ داری" آکاش بیل کی صورت اختیار کر کے پوری معیشت کا خون نہ چوس لے۔ لیکن مناسب ہے کہ پہلے اس دوسرے پہلو پر غور کر لیا جائے جو بنیادی طور پر تو اسلام کے قانونی نظام معیشت اور مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام میں قدر مشترک کے طور پر موجود ہے' تاہم متعدد اعتبارات سے ان کے مابین "چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک" والا معاملہ ہے۔ اور وہ ہے سرمایہ دارانہ نظام کا داخلی انضباط!

اس کی جڑ اور بنیاد یہ ہے کہ جہاں بھی شخصی ملکیت' ذاتی حوصلہ مندی' اور آزادانہ مسابقت کا معاملہ ہوگا' لوگوں کے مابین ذہانت و صلاحیت اور محنت و مشقت کے طبعی فرق و تفاوت کے باعث معاشی اونچ نیچ پیدا ہو کر رہے گی' جسے ایک حد کے اندر اندر رکھنا معاشرے کی مجموعی صحت اور زندگی کے لئے لازمی ہے۔ اس لئے کہ اگر یہ خلیج زیادہ بڑھ جائے تو معاشرے میں "مترفین" یعنی "HAVES" اور "محرومین" یعنی "HAVE NOTS" کے طبقات پیدا ہو جائیں گے' جو طبقاتی کشمکش کا باعث بنیں گے اور اس سے معاشرہ شکست و ریخت کا شکار ہو جائے گا۔ چنانچہ اسی ضرورت کے تحت مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام نے کہیں "بے روزگاری الاؤنس" کے نام سے (جیسے برطانیہ میں ہے) اور کہیں "ویلفیئر" کے نام سے (جیسے امریکہ اور بعض یورپی ممالک میں ہے) سرمایہ دارانہ نظام کے "اندرونی انضباط" کی کوشش کی ہے' جس کی سطح کے اعتبار سے اس اصول کے تحت کہ "شیطان کو بھی اس کا جائز حق ضرور دیا جائے" یہ تسلیم کیا جانا چاہئے کہ بعض یورپی ممالک' جیسے سویڈن' ناروے اور ڈنمارک' ایک بار تو ناقابل یقین بلندی کی حدوں تک پہنچ گئے تھے' تاہم

چونکہ یہ معاملہ غیر فطری اور غیر طبعی تھا لہٰذا اب کسی قدر نیچے اترنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

شریعتِ اسلامی نے یہی ضرورت زکوٰۃ کے نظام کے ذریعے پوری کی ہے' جس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا نہایت حکیمانہ قول ہے کہ: "تُؤْخَذُ مِن اَغنِیَائِھِم فَتُرَدُّ اِلٰی فُقَرَائِھِم" (صحیح بخاریؒ' عن ابن عباسؓ) یعنی "وہ مسلمانوں کے مالدار لوگوں سے وصول کی جاتی ہے اور غرباء میں تقسیم کر دی جاتی ہے!" اور اس سے نہ صرف یہ کہ آزاد معیشت کے "داخلی انضباط" کا وہ مقصد بہ تمام و کمال حاصل ہو جاتا ہے جس کی وضاحت اوپر کی گئی ہے' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست فی الحقیقت ایک ویلفیئر اسٹیٹ کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو "کفالتِ عامہ" کی ذمہ داری جس حد تک قبول کرتی ہے اس کا کسی قدر اندازہ حضرت عمرؓ کے اس قول سے کیا جا سکتا ہے کہ "اگر دجلہ و فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مر گیا تو قیامت کے روز عمرؓ ذمہ دار ہو گا!"

زکوٰۃ کے نظام کی دوسری خصوصیت جو اسے مغرب کے ویلفیئر نظام سے مشابہ کرتی ہے' یہ کہ اصولی اعتبار سے زکوٰۃ کی ادائیگی دوسرے صدقاتِ نافلہ کے برعکس افراد کی صوابدید پر نہیں چھوڑی گئی بلکہ یہ ایک خالص ریاستی معاملہ ہے۔ لہٰذا یہ صاحب نصاب لوگوں سے جبراً اور پورے حساب کتاب کے ساتھ وصول کی جاتی ہے۔ تاہم یہ معاملہ مصلحتِ عامہ کے پیش نظر صرف "اموالِ ظاہرہ" یعنی اموال تجارت وغیرہ کی حد تک محدود کر دیا گیا ہے۔ اور "اموالِ باطنہ" جیسے وہ زیورات یا نقدی وغیرہ جو گھروں میں رکھی گئی ہو ان کی زکوٰۃ کی ادائیگی کو لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ چاہیں تو حکومت کے حوالے کر دیں اور چاہیں تو خود ادا کر دیں۔ (چنانچہ ایسے ہی اموال کی زکوٰۃ تھی جس کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ دورِ خلافتِ راشدہ میں لوگ اسے لے کر پھرا کرتے تھے اور اس کا قبول کرنے والا نہیں ملتا تھا!)

بہرحال ان دو جزوی اور سطحی مشابہتوں کے علاوہ شریعت اسلامی کا نظامِ زکوٰۃ

مغرب کے ویلفیئر کے نظام سے بہت اعلیٰ اور ارفع ہے، جس کے چند پہلو حسب ذیل ہیں:

(i) زکوٰۃ عبادت ہے ٹیکس نہیں، لہٰذا جس شخص کے دل میں ذرا بھی ایمان ہو گا وہ زکوٰۃ پوری پوری ادا کرے گا، جبکہ ٹیکس سے بچنے کی کوشش ایک قاعدہ کلیہ اور متفق علیہ معاملہ ہے۔ چنانچہ بالکل نماز کی طرح جس کی فرضیت قرآن کی جانب سے ہوئی اور اس کے اوقات و رکعات کا نظام نبی اکرم ﷺ نے عطا فرمایا، زکوٰۃ کی بھی فرضیت قرآن کے ذریعے ہوئی، اور اس کے نصاب اور شرح کا نظام آنحضور ﷺ نے متعین فرمایا۔ اور جو لوگ اس نظام میں ردوبدل کے جواز کے قائل ہیں وہ اپنی ناسمجھی میں زکوٰۃ کو "عبادت" کی بجائے "ٹیکس" کی صورت دے کر اس کی اصل روح کو ختم کر دینے کے درپے ہیں!

(ii) نظامِ زکوٰۃ کے اعتبار سے "اغنیاء" اور "فقراء" کا تعین عرفِ عام پر نہیں چھوڑ دیا گیا کہ مالدار وہی سمجھا جائے جو لکھ پتی یا کروڑ پتی ہو، اور فقیر وہی قرار دیا جائے جسے فاقے آ رہے ہوں یا جو بھیک مانگتا پھر رہا ہو، بلکہ "نصاب" کی ایک لائن کھینچ دی گئی ہے کہ جو شخص بھی اس سے اوپر ہے وہ "غنی" یعنی زکوٰۃ کا ادا کنندہ (DONOR) ہے، اور جو اس سے نیچے ہے وہ زکوٰۃ کا وصول کنندہ (RECIPIENT) ہے۔ چنانچہ اس اصول کی بنیاد پر ایک مکمل سوشل انشورنس کا نظام قائم کیا جا سکتا ہے جس سے معاشرے میں HAVES اور HAVE-NOTS کے مابین ایک حسین توازن قائم ہو جائے!

(iii) مغربی ممالک میں سوشل انشورنس کا اصل نظام لوگوں کی اپنی ادائیگی یعنی CONTRIBUTION کی بنیاد پر قائم ہے۔ ورنہ خالص اور اصل ویلفیئر کی سطح تو بہت ہی کم یعنی صرف SUBSISTENCE LEVEL پر ہے۔ جبکہ زکوٰۃ کے نظام میں اس کے حق داروں اور وصول کنندگان کی جانب سے کسی CONTRIBUTION کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور ہر وہ شخص اس کا حق دار

ہے جس کی اپنی مالی حیثیت کسی بھی سبب سے "نصاب" سے کم تر ہو!

(iv) تاہم شریعت اسلامی نے زکوٰۃ کے نظام میں ایک حسین توازن ایسے پیدا کر دیا ہے کہ زکوٰۃ و صدقات کو "اَوْسَاخُ النَّاس" یعنی لوگوں کا میل کچیل قرار دے کر نہ صرف لوگوں کو ترغیب دی ہے، بلکہ ان کی غیرت کو جھنجوڑا ہے کہ اپنے ہاتھوں کی محنت سے معاش حاصل کر کے خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرو، اور لوگوں کے میل کچیل سے اپنے پیٹ مت بھرو!

چنانچہ اسی معاملے میں مزید زور پیدا کرنے کے لئے نبی اکرم ﷺ نے اپنی ذات اور اپنے خاندان کے لئے زکوٰۃ اور صدقات کو حرام قرار دے دیا۔ تاہم عام لوگوں کے اعتبار سے یہ بھی صرف ایک اخلاقی تعلیم ہے، قانون نہیں! البتہ اس سے اس اندیشے کا سدِباب ہو جاتا ہے جس کے باعث سویڈن جیسے ملکوں کو ویلفیئر کی سطح کو نیچے لانا پڑ رہا ہے۔ یعنی جب بغیر محنت کئے بھی گزر بسر ہو جائے تو۔

"زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہگزر یاد آیا!"

کے مصداق خواہ مخواہ زیادہ محنت اور مشقت کیوں برداشت کی جائے! کیوں نہ ویلفیئر کو شیرِ مادر کی طرح ہضم کیا جائے!

قصہ مختصر، زکات کا نظام اسلام کے قانونی نظام معیشت کا اہم ستون ہے جس سے اس کی "آزاد معیشت" سے پیدا شدہ معاشی ناہمواری کا "داخلی انتظام و انضباط" بطریق احسن ہو جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ صدیوں سے تو مسلمانوں نے اسے ذاتی خیرات کا معاملہ بنا رکھا تھا، حال ہی میں جنرل ضیاء الحق مرحوم نے اسے بڑی آن بان اور شان کے ساتھ نافذ کیا تو اس طور سے کہ بس ایک منظم بھکاری پن (ORGANIZED BEGGARY) کی صورت پیدا ہو گئی اور "بدنام کنندگانِ نکونامے چند!" کے مصداق زکوٰۃ کے نظام ہی کو بدنام کر کے رکھ دیا!

اب آئندہ صفحات میں شریعتِ اسلامی کے ان احکام اور اقدامات پر گفتگو ہوگی

جن کے ذریعے آزاد معیشت کے اسلامی نظام میں "سرمایہ کاری" کی فضا کو بھرپور طور پر برقرار رکھتے ہوئے "سرمایہ داری" کی لعنت کو وجود میں آنے سے روکا گیا ہے' جن میں سرفہرست سود کی حرمت ہے!

سود اور جوئے کی حرمت کی حکمت

الحمدللہ کہ اس سے قبل حسب ذیل امور کی کسی قدر وضاحت ہو چکی ہے کہ:

(۱) ایمان اور احسان کی سطح پر اسلام کی تعلیمات کا نقطۂ عروج "اختیاری فقر" ہے جو گویا روحانی سوشلزم کی بلند ترین صورت ہے۔

(۲) عمومی اور قانونی سطح پر اسلام کا معاشی نظام مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام سے اس بنا پر بھی مشابہ ہے کہ اس میں نجی ملکیت' انفرادی حوصلہ مندی' آزادانہ مسابقت' منڈی کی معیشت' اور ملازم رکھنے اور فارغ کر دینے کے اختیار کے وہ جملہ اصول موجود ہیں جن کو ردّ یا نظرانداز کرنے کی بنا پر کمیونزم کی موت واقع ہوئی اور اس کے مقابلے میں مغرب کے اس سرمایہ دارانہ نظام کو فتح حاصل ہوئی جس نے ان اصولوں کو اختیار کیا۔ اگرچہ وہ اپنی جگہ ایک نہایت ظالمانہ اور استحصالی نظام ہے۔

(۳) مزید برآں' یہ مشابہت اس پہلو سے بھی ہے کہ مغربی سرمایہ دارانہ نظام نے اندرونی اور داخلی انضباط کی جس ضرورت کو بے روزگاری الاؤنس یا ویلفیئر یا اجتماعی انشورنس کے ذریعے پورا کرنے کی کوشش کی اسے اسلام نے اس سے کہیں اعلیٰ و ارفع اور زیادہ متوازن اور قابل عمل صورت میں زکوٰۃ کے نظام کے ذریعے باحسن وجوہ پورا کر دیا۔

اب آیئے کہ ہدایتِ خداوندی اور آسمانی شریعتوں یعنی شریعتِ موسویؑ اور شریعتِ محمدیؐ کے ان احکام پر غور کریں جن کے ذریعے خالص عقل انسانی کے اعتبار سے یہ ناممکن الحصول مقصد حاصل ہو جاتا ہے کہ "سرمایہ کاری" کی فضا کو بھرپور طور پر برقرار رکھنے کے باوجود "سرمایہ داری" کی لعنت پیدا نہ ہونے پائے۔ یعنی دولت کا

ارتکاز ایک محدود حلقے میں نہ ہو بلکہ وہ پورے معاشرے میں توازن اور ہمواری کے ساتھ گردش کرے۔

قرآن حکیم نے اس بنیادی مقصد کو سورۃ الحشر کی ساتویں آیت کے ان مختصر ترین الفاظ میں بیان کیا ہے کہ : "کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ" یعنی "تا کہ وہ (سرمایہ) تمہارے امیر لوگوں ہی کے مابین گردش میں نہ رہے!"۔ اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے خالص عقلِ انسانی کی رسائی کی آخری منزل یا "معراج" یقیناً مارکس کا فلسفہ اور کمیونزم کا نظام ہی تھا لیکن وہ حقائق و واقعات کی تجربہ گاہ میں ناکام ثابت ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ علامہ اقبال کے اس شعر کے مطابق کہ۔

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے!

عقل کی کوتاہی اور درماندگی کو تسلیم کر لیا جائے اور ہدایتِ آسمانی کی جانب رجوع کیا جائے۔

آسمانی شریعتوں نے اس مقصدِ عظیم کو چند مالی معاملات کو حرام اور ممنوع قرار دے کر حاصل کیا ہے جن میں سے MASTER-STROKE کی حیثیت سود اور جوئے کی حرمت کو حاصل ہے۔ چنانچہ ان دونوں ہی کو قرآن حکیم نے شیطانِ لعین کی جانب منسوب کیا ہے۔ جیسے کہ سود کے بارے میں سورۃ البقرہ کی آیت ۲۷۵ میں فرمایا: "اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ "یعنی "جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قیامت کے روز) نہیں اٹھیں گے مگر ان لوگوں کے مانند جنہیں شیطان نے اپنی چھوت کے ذریعے پاگل بنا دیا ہو!" اور سورۃ المائدہ کی آیات ۹۰ اور ۹۱ میں شراب وغیرہ کے ساتھ ساتھ جوئے کو بھی ان "ناپاک شیطانی کاموں" (رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ) میں شمار کیا گیا ہے جن کے ذریعے شیطان انسانوں میں "عداوت اور بغض" پیدا کرنا چاہتا ہے!

تو اگرچہ ایک بندۂ مومن کے لئے تو حِلّت اور حرمت کے معاملے میں صرف اللہ اور رسولؐ کا حکم ہی آخری' قطعی اور حتمی بات ہے جس پر مستزاد کسی عقلی اور منطقی دلیل کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے جب کچھ لوگوں نے یہ اعتراض وارد کیا کہ: "اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا" یعنی "بیع بھی تو ربا کے مثل ہی ہے" (البقرہ:۲۷۵) تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے بیع اور ربا کے مابین فرق و تفاوت کو کسی عقلی اور منطقی دلیل کے ذریعے واضح نہیں فرمایا بلکہ زجر اور ملامت کے انداز میں فرمایا: "وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا" یعنی "حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربا کو حرام!" (اگرچہ اس کا ایک لطیف سبب یہ بھی ہے کہ سود کے گھناؤنے پن کو حرمتِ ربا کے آخری حکم کے نزول سے لگ بھگ پندرہ سال قبل سورۃ الروم کی ایک آیت میں "عاقلاں را اشارہ کافی است!" کے مطابق لطیف ترین اور مختصر ترین انداز میں واضح کر دیا گیا تھا' جس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا!) تاہم چونکہ عہدِ حاضر میں عام طور پر لوگ عقلیت پسند سے بھی آگے بڑھ کر "عقلیت پرست" بن گئے ہیں' لہٰذا سود اور جوئے کی حرمت کی حکمت و علت کی کسی قدر عقلی وضاحت مناسب ہے۔

اس سلسلے میں یہ خالص فلسفیانہ بحث کہ اصل عاملِ پیداوار محنت ہے یا سرمایہ' جہاں ایک روزنامے کے کالموں کی حدود سے متجاوز ہے' وہاں انڈا پہلے تھا یا مرغی کے سوال کے مانند لایعنی اور لاحاصل بھی ہے۔ اسی طرح کسی منفعت بخش پیداواری عمل میں کس قدر حصہ سرمائے کا ہے اور کتنا محنت کا' اس کا یقینی اور حتمی تجزیہ بھی قطعاً ناممکن ہے۔ اصل مسئلے کے فہم کے لئے اس سادہ ترین بنیادی حقیت کو سامنے رکھ لینا کافی ہے کہ ہر قابلِ لحاظ پیداواری عمل میں دو عوامل تو اساسی اور بنیادی طور پر لازماً شامل ہوتے ہیں' یعنی محنت اور سرمایہ اور ایک تیسرا عامل بھی خواہ ثانوی درجہ ہی میں سہی بہرحال کسی نہ کسی حد تک ضرور موجود ہوتا ہے' یعنی "موقع" یا چانس۔ اور مالی معاملات میں شریعتِ الٰہی میں حلّت اور حرمت کا اصل الاصول یہ ہے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ زور بھی انسانی محنت پر دیا گیا ہے اور زیادہ سے زیادہ تحفظ بھی اسی کو فراہم کیا

گیا ہے، جبکہ سرمایہ کو بروئے کار آنے کی اجازت تو دی گئی ہے لیکن حضرت سلیمانؑ کے "مُقَرَّنِیْنَ فِی الْاَصْفَادِ" جنّات کے مانند کسی قدر پابندِ سلاسل کر کے تاکہ یہ پیداواری عمل میں مناسب حصہ تو ادا کرے لیکن نہ محنت کا استحصال کر سکے، نہ محنت کے بغیر محض موقع یا چانس کے رِسک کے ذریعے افزائش و افزودگی حاصل کرنے کی کوشش کر سکے۔ اس لئے کہ انہی دو ذرائع کی بنا پر سرمایہ پوری معیشت پر آکاش بیل کی طرح مسلط ہو جاتا ہے۔

ان میں سے جہاں تک مؤخرالذکر معاملے کا تعلق ہے اس کی حکمت و علّت تو اظہر من الشمس ہے۔ یعنی سرمایہ جب بغیر محنت کے محض موقع اور چانس کے رِسک یعنی "داؤ" کے ذریعے کمائی کی کوشش کرتا ہے تو اس سے زیریں اور انفرادی سطح پر تو محنت و مشقت سے فرار اور حقائق سے گریز کا وہ رجحان پیدا ہوتا ہے جو۔

"مے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو
اِک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے"

کے مصداق نشہ آور چیزوں کے استعمال کی اصل غرض و غایت ہے۔ (یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جوئے کو سورۃ البقرہ کی آیت ۲۱۹ اور سورۃ المائدہ کی آیات ۹۰-۹۱ میں "خَمر" یعنی شراب کے ساتھ بریکٹ کیا ہے!) اور معیشت کی اجتماعی اور بالائی سطح پر اشیائے صَرف کی قیمتوں میں بے جواز اضافے، اور ان میں اچانک کمی بیشی کے ذریعے منڈی کے عدم استحکام کے مہلک نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت نے ایک جانب جوئے، سٹے اور لاٹری کے قبیل کی جملہ چیزوں کو حرامِ مطلق قرار دیا، اور دوسری جانب مستقبل کے سودوں کے ضمن میں سخت پابندیاں عائد کر دیں۔ چنانچہ بیع و شراء یعنی خرید و فروخت کی بہترین اور پسندیدہ صورت تو یہ قرار دی کہ صرف حاضر اور موجود مال کا سودا ہو تاکہ مبادلہ دست بدست ہو جائے، لیکن اگر کسی سماجی ضرورت کے تحت کوئی مستقبل کا سودا کیا جائے تو کُل طے شدہ قیمت کا کوئی حصہ یعنی دس یا بیس فی صد نہیں بلکہ کُل کی کُل قیمت فوری طور پر ادا کر دی جائے تاکہ سرمایہ کو

اپنی اصل قدر اور مالیت سے زیادہ کا کاروبار کرنے یعنی OVER-TRADING کا موقع نہ مل سکے۔ (اسے فقہ اسلامی میں "بیع سَلَم" کہتے ہیں!)

البتہ سود کی حرمت کا معاملہ ذرا زیادہ قابلِ غور ہے۔ اس کی حکمت و علّت کو سورۃ الروم کی آیت ۳۹ میں حد درجہ اختصار اور غایت درجہ فصاحت و بلاغت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے' یعنی یہ کہ اصل حقیقت کے اعتبار سے سود یا رِبا یہ ہے کہ کسی شخص کا سرمایہ کسی دوسرے شخص کے مال میں نشو و نما پائے اور افزائش و افزودگی حاصل کرے۔ (" لِیَرْبُوَ فِی اَمْوَالِ النَّاسِ ! ") اور یقیناً یہی سبب ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے سود کو "زنا" سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس لئے کہ زنا کی صورت میں بھی کسی مرد کا نطفہ اپنی منکوحہ بیوی کی بجائے ناجائز طور پر کسی دوسری عورت کے رحم میں پرورش پاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایک شریف انسان زنا کا تو لفظ بھی زبان پر لانے سے ہچکچاتا ہے' جب کہ سود کو عام طور پر ماں کے دودھ کے مانند مباح بنا لیا گیا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ زنا کے برے اثرات زیادہ تر انفرادی یا معاشرے کی زیریں سطح تک محدود رہتے ہیں جب کہ سود کے ذریعے "سرمایہ داری" کی لعنت پورے معاشرے پر آکاش بیل کی طرح چھا جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضور ﷺ نے سود کو زنا سے سینکڑوں گنا زیادہ قبیح قرار دیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی سنن ابن ماجہؒ کی روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

الرِّبَا سبعونَ جُزءً ا أَیْسَرُھا اَنْ یَنکِحَ الرَّجلُ اُمَّہ

"ربا کے گناہ کے ستر حصے ہیں۔ جن میں سے سب سے چھوٹا اور حقیر حصہ اس کے مساوی ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کرے!"

اور اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں سود پر اپنی اور اپنے رسولؐ کی جانب سے اعلانِ جنگ کی وعید بایں الفاظ سنائی ہے :

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ (البقرہ: ۲۷۹)

"پھر اگر تم یہ نہ کرو (یعنی سود سے باز نہ آؤ) تو پھر اللہ اور اس کے رسول سے

جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ!"

اس معاملے کو سادہ ترین انداز میں یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے ذاتی سرمائے سے کاروبار کر رہا ہو اور اس میں محنت بھی یا صرف اس کی اپنی ہو یا دوسرے انسانوں سے معیّن روزانہ اجرت یا ماہانہ تنخواہ کے عوض، تو اس معاملے میں نہ کوئی معاشی یا مالیاتی پیچیدگی ہے نہ شرعی قدغن۔ اسی طرح اگر بہت سے لوگ اپنا سرمایہ بھی جمع کرلیں اور سب مل جل کر کام بھی کریں اور نفع و نقصان میں شریک ہو جائیں تو یہ "شراکت" بھی ہر اعتبار سے حلال و طیب ہے اور اس کی اساس پر بڑے سے بڑے پیمانے پر تجارت اور صنعت کا کام کیا جاسکتا ہے۔ اصل مسئلہ وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں محنت کسی اور کی ہو اور سرمایہ کسی اور کا۔ چنانچہ اس معاملے میں اکبر الٰہ آبادی کے اس شعر کے مصداق کہ۔

جہاں ہستی ہوئی محدود، لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
شریعت، عقل، منطق سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو اپنی ابتدائی صورت میں تو بڑی "معصوم" نظر آتی ہیں لیکن ان کے نتیجے میں معاشرے میں طبقاتی تقسیم پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ظلم، جبر اور استحصال کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔

ان پیچیدگیوں کے ضمن میں شریعتِ اسلامی کا اصل الاصول تو یہ ہے کہ اس کے نزدیک سرمایہ کو AS SUCH یعنی محض سرمائے کی حیثیت سے "کماؤ" یعنی EARNING AGENT تسلیم کیا جانا "ناپسند" ہے۔ چنانچہ اس کی ایک انتہائی صورت کو تو اس نے سود یا ربا قرار دے کر صرف حرامِ مطلق ہی نہیں بلکہ اتنا حرام قرار دیا ہے کہ سوائے شرکِ جلی کے کوئی اور عمل اتنا حرام نہیں ہے۔ اور ایک صورت کو سماجی ضرورت کے پیشِ نظر جائز قرار دیا ہے تو اس میں سرمائے کے لئے رِسک کو اتنا بڑھا دیا ہے کہ محض منفعت کا طالب سرمایہ کبھی اس کی جانب رخ ہی نہیں کرے گا۔

چنانچہ سود یا ربا تو یہ ہے کہ سرمایہ محض سرمائے کی حیثیت میں منفعت کا طالب ہو۔

نقصان کا رِسک بالکل قبول نہ کرے' اور منفعت بھی ایک معین شرح پر طلب کرے! یہ معاملہ خواہ نجی ضرورتوں کے سلسلے میں' یعنی USURY کی صورت میں ہو' خواہ کسی تجارتی یا صنعتی معاملے میں' یعنی COMMERCIAL INTEREST کی صورت میں ہو' یکساں طور پر حرامِ مطلق' اپنی شناعت اور خباثت میں ماں کے ساتھ بدکاری سے سینکڑوں گنا زیادہ' اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ جنگ کے مترادف ہے! اس لئے کہ اس صورت میں سرمایہ دار کا سرمایہ دوسرے لوگوں کے مال میں شامل ہو کر' ان کی محنت اور مشقت کے طفیل افزائش اور افزودگی حاصل کرتا ہے اور اس طرح گویا پیسہ بغیر محنت اور نقصان کے رِسک کے محض پیسے کی حیثیت سے پیسے کو کھینچتا چلا جاتا ہے' جس سے ارتکازِ زر کی صورت پیدا ہوتی ہے اور دولت اور سرمایہ چند ہاتھوں میں جمع ہوتا چلا جاتا ہے' اور اس کے نتیجے میں اجتماعی سطح پر تو معاشرے میں محبت اور اخوت کی بجائے نفرت و عداوت کا بازار گرم ہو جاتا ہے اور تعاضد و تعاون کی بجائے کشاکش اور تصادم کی صورت پیدا ہو جاتی ہے' اور انفرادی اعتبار سے سود خور انسان درندوں اور خون چوسنے والی چمگادڑوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ بقول علامہ اقبال۔

از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن!
کس نداند لذّتِ قرضِ حسن
از ربا جاں تیرہ' دل چوں خشت و سنگ
آدمی درّندہ بے دندان و چنگ

یعنی سود جیسی ام الخبائث کے بطن سے آخر فتنوں کے سوا اور کیا چیز جنم لے سکتی ہے! افسوس کہ لوگوں کو قرضِ حسنہ (یعنی ایسا قرض جس میں صرف اصل زر ہی کی واپسی کا وعدہ ہو' بغیر کسی اضافے کے!) کی لذت کا احساس و ادراک حاصل نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سود سے انسان کا باطن تاریک اور دل اینٹ پتھر کے مانند سخت ہو جاتا ہے اور انسان درندوں کی طرح کے پنجوں اور دانتوں کے بغیر فی الواقع درندہ بن جاتا ہے!

سرمایہ کے محض سرمائے کی حیثیت سے نفع کے مستحق ہونے کی جس صورت کو شریعتِ اسلامی نے بدرجۂ آخر اور کراہت کے ساتھ (اس کی وضاحت بعد میں کسی موقع پر آئے گی) جائز قرار دیا ہے وہ "مضاربت" کا معاملہ ہے، جس میں سرمایہ کسی اور (ربّ المال) کا ہوتا ہے اور محنت کوئی اور (مضارب عامل) کرتا ہے۔ اس صورت میں اگر نفع ہو تو وہ ان دونوں کے مابین پہلے سے طے شدہ شرح کے مطابق تقسیم ہو جاتا ہے۔ اس طرح گویا اس معاملے میں سرمایہ کو محض سرمائے کی حیثیت سے "کماؤ" (EARNING AGENT) تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ MASTER STROKE بھی صرف حکمتِ الٰہی اور حکمتِ نبوی ﷺ ہی کے لئے ممکن تھا کہ اس "شر" کی تلافی اس طرح کر دی گئی کہ اگر نقصان ہو جائے تو وہ سارے کا سارا ربّ المال یعنی سرمایہ دار برداشت کرے گا، مضارب عامل پر کسی قسم کے نقصان کی کوئی ذمہ داری یا تاوان عائد نہیں کیا جائے گا! لہٰذا سود خورانہ ذہنیت کے حامل شائیلاک اس صورت کی جانب کبھی رجوع ہی نہیں کر سکتے بلکہ یہ صورت صرف ایسے لوگ ہی اختیار کر سکتے ہیں جن میں ذاتی جلبِ منفعت کے ساتھ ساتھ اور کم از کم اس کے مساوی اور برابر اپنے کسی بھائی کی مدد کا جذبہ بھی موجود ہو!

مضاربت کے اصول پر کوئی شخص اپنا سرمایہ کسی دوسرے شخص (عامل) کے حوالے، ظاہر ہے کہ، صرف دو صورتوں میں کر سکتا ہے : ایک یہ کہ وہ خود کام کرنے سے معذور ہو، اور دوسرے یہ کہ وہ خود کسی اور کام جیسے مثلاً ملازمت وغیرہ میں مشغول و مصروف ہو اور اس کے پاس "بچت" کی صورت میں کچھ فاضل سرمایہ جمع ہو جائے۔ پہلی صورت میں ایک غیور اور خوددار شخص لازماً یہ چاہے گا کہ بجائے اس کے کہ جو تھوڑی بہت پونجی اس کے پاس ہو اسے کھا کر ختم کر دے اور اس کے بعد "یقینی" طور پر زکوٰۃ و صدقات کے مستحق لوگوں میں شامل ہو جائے کیوں نہ اپنی پونجی کو مضاربت کے اصول پر کسی قابلِ اعتماد شخص یا ادارے کے حوالے کر دے تاکہ اللہ کو منظور ہو تو اس کی گذر بسر زکوٰۃ و صدقات کے بغیر ہوتی رہے! رہی دوسری صورت

تو یہ فاضل سرمایہ ہی اصل میں اسلامی معاشیات کی وہ "قدرِ زائد" ہے جس کے ضمن میں' اسلام کی ایمانی و احسانی' اور فقہی و قانونی تعلیمات کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو' اس کے حامل کے سامنے چار راستے کھلے ہیں : (i) بلند ترین تو یہ ہے کہ اس "عفو" کو غرباء اور مساکین کو دے کر خود فارغ اور سرخرو ہو جائے اور اپنے لئے روحانی ترفع کا سامان فراہم کر لے۔ (ii) اس سے کم تر درجے میں یہ کہ اسے "قرضِ حسن" کی صورت میں اپنے کسی ایسے بھائی کو دیدے جو کام تو کر سکتا ہو لیکن سرمایہ سے محروم ہو تاکہ وہ اس کے ذریعے اپنی معاشی گاڑی کو سٹارٹ کر کے اس کی اصل رقم بغیر کسی اضافے کے اسے لوٹا دے (یا اگر کوئی اضافہ کرے تو خالص اختیاری طور پر اپنی آزاد مرضی بلکہ خواہش سے' یعنی بطور ہدیہ!)۔ (iii) اس سے بھی فروتر درجہ یہ ہے کہ وہ اپنی رقم مضاربت کے اصول پر کسی عامل کے حوالے کر دے' نقصان ہو تو پورا خود برداشت کرے اور اگر نفع ہو تو اس میں سے ایک حصہ وصول کر لے۔ یہ جائز کی آخری حد ہے جو اوپر کی دونوں پسندیدہ اور مطلوبہ سطحوں سے فروتر ہونے کے باعث ان کے مقابلے میں "مکروہ" شمار ہو گی! — (iv) اور آخری اور بدترین اور اسفل ترین یہ کہ یہ سرمایہ بغیر نقصان کا رِسک لئے نفع کی معیّن شرح پر دوسروں کے حوالے کر دیا جائے — یہ سود اور ربا ہے — ماں کے ساتھ بدکاری سے سینکڑوں گنا زیادہ — اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف کھلا اعلانِ جنگ!

عَنِ الحَارِثِ الاشعَرِی، قَال، قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ:

"اٰمُرُکُم بِخَمسٍ

بِالجَمَاعَۃِ وَالسَّمعِ وَالطَّاعَۃِ وَالھِجرَۃِ وَالجِھَادِ فِی سَبِیلِ اللّٰہِ"

(مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ مسند احمد و جامع ترمذی)

مولانا مفتی عبد الرؤف صاحب

عید کے موقع پر مصافحہ اور معانقہ

ہمارے ہاں عیدین پر "عید ملنے" کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے اور اس موقع پر باہم گلے ملنا لازم خیال کیا جاتا ہے مفتی عبد الرؤف صاحب نے اس "رسم دنیا" کی شرعی حیثیت پر قلم اٹھایا ہے اور اس بارے میں علمائے اہلِ سنّت کا مؤقف بیان کیا ہے۔ ہم ان کا یہ مضمون جامعہ اشرفیہ کراچی کے ترجمان جریدہ "الاشرف" کے شکریہ کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

عید الفطر کا دن مسلمانوں کے لئے بڑی مسرت اور خوشی کا دن ہے اور یہ خوشی اس بنا پر ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے رمضان شریف کے روزے رکھنے کی توفیق بخشی اور شب میں تراویح ادا کرنے اور اس میں کلام الٰہی پڑھنے اور سننے کی سعادت عطا فرمائی حق تعالیٰ کے نزدیک عید کا دن اور عید کی رات دونوں ہی بہت مبارک اور بڑی فضیلت والے دن ہیں جس کا اندازہ آپ کو اس حدیث سے ہوگا۔

عید اور شب عید کی خاص فضیلت

حدیث: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جنت کو رمضان شریف کے لئے خوشبوؤں کی دھونی دی جاتی ہے اور شروع سال سے آخر سال تک رمضان کی خاطر آراستہ کیا جاتا ہے پس جب رمضان المبارک کی پہلی رات ہوتی ہے تو عرش کے نیچے سے ایک ہوا چلتی ہے جس کا نام مثیرہ ہے اس کے جھونکوں کی وجہ سے جنت

کے درختوں کے پتے اور کواڑوں کے حلقے بجنے لگتے ہیں جس سے ایسی دل آویز سُریلی آواز نکلتی ہے کہ سننے والوں نے اس سے اچھی آواز کبھی نہیں سنی پس خوشنما آنکھوں والی حوریں اپنے مکانوں سے نکل کر جنت کے بالاخانوں کے درمیان کھڑے ہو کر آواز دیتی ہیں کہ کوئی ہے اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہم سے منگنی کرنے والا تاکہ حق تعالیٰ شانہ اس کو ہم سے جوڑ دیں پھر وہی حوریں جنت کے دار و غر رضوان سے پوچھتی ہیں کہ یہ کیسی رات ہے وہ لبیک کہہ کر جواب دیتے ہیں کہ رمضان المبارک کی پہلی رات ہے جنت کے دروازے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے لئے آج کھول دیئے گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ شانہ رضوان سے فرما دیتے ہیں کہ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے روزہ داروں پر جہنم کے دروازے بند کر دیئے جائیں جبرئیل علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے کہ زمین پر جاؤ اور سرکش شیاطین کو قید کر و اور گلے میں طوق ڈال کر دریا میں پھینک دو کہ میرے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے روزوں کو خراب نہ کریں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ حق تعالیٰ شانہ رمضان کی ہر رات میں ایک منادی کو حکم فرماتے ہیں کہ تین مرتبہ یہ آواز دے کہ ہے کوئی مانگنے والا جس کو میں عطا کروں ہے کوئی توبہ کرنے والا کہ میں اس کی توبہ قبول کروں۔ کوئی ہے مغفرت چاہنے والا کہ میں اس کی مغفرت کروں۔ کون ہے جو غنی کو قرض کر دے ایسا غنی جو نادار نہیں ایسا پورا پورا ادا کرنے والا جو ذرا بھی کمی نہیں کرتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ شانہ رمضان شریف میں روزانہ افطار کے وقت ایسے دس لاکھ آدمیوں کو جہنم سے خلاصی مرحمت فرماتے ہیں جو جہنم کے مستحق ہو چکے تھے اور جب رمضان شریف کا آخری دن ہوتا ہے تو یکم رمضان سے آج تک جس قدر لوگ جہنم سے آزاد ہو کر گئے تھے ان کے برابر اس ایک دن میں آزاد فرماتے ہیں

اور جس رات شب قدر ہوتی ہے تو حق تعالیٰ شانہ حضرت جبرئیل کو حکم فرماتے ہیں وہ فرشتوں کے ایک بڑے لشکر کے ساتھ زمین پر اترتے ہیں ان کے ساتھ ایک سبز جھنڈا ہوتا ہے جس کو کعبہ کے اوپر کھڑا کرتے ہیں اور حضرت جبرئیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سو بازو ہیں۔ جن میں سے دو بازوؤں کو صرف اسی رات میں کھولتے ہیں جن کو مشرق سے مغرب تک پھیلا دیتے ہیں پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام فرشتوں کو تقاضا فرماتے ہیں کہ جو مسلمان آج کی رات میں کھڑا ہوا بیٹھا ہو نماز پڑھ رہا ہو یا ذکر کر رہا ہو اس کو سلام کریں اور مصافحہ کریں ان کی دعاؤں پر آمین کہیں صبح تک یہی حالت رہتی ہے جب صبح ہو جاتی ہے تو جبرئیل علیہ السلام آواز دیتے ہیں کہ اے فرشتوں کی جماعت اب کوچ کرو اور چلو فرشتے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے مومنوں کی جماعتوں اور ضرورتوں میں کیا معاملہ فرمایا۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر توجہ فرمائی اور چار شخصیتوں کے علاوہ سب کو معاف فرما دیا۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ چار شخص

کون ہیں۔ ؟ارشاد ہوا کہ۔

- ایک وہ شخص جو شراب کا عادی ہو۔
- دوسرا وہ شخص جو والدین کی نافرمانی کرنے والا ہو۔
- تیسرا وہ شخص جو قطع رحمی کرنے والا اور ناطہ توڑنے والا ہو۔
- چوتھا وہ شخص جو کینہ رکھنے والا ہو اور آپس میں قطع تعلق کرنے والا ہو۔

پھر جب عید الفطر کی رات ہوتی ہے تو اس کا نام آسمانوں پر لیلۃ الجائزہ (انعام کی رات) سے لیا جاتا ہے اور جب عید کی صبح ہوتی ہے تو حق تعالیٰ شانہ، فرشتوں کو تمام شہروں میں بھیجتے ہیں وہ زمین پر اتر کر تمام گلیوں راستوں کے سروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایسی آواز سے جس کو جنات اور انسان کے سوا ہر مخلوق سنتی ہے پکارتے ہیں کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت اس کریم رب کی درگاہ کی طرف چلو جو بہت زیادہ عطا فرمانے والا ہے اور بڑے سے بڑے قصور کو معاف کرنے والا ہے۔ پھر جب لوگ عید گاہ کی طرف نکلتے ہیں تو حق تعالیٰ شانہ فرشتوں سے دریافت فرماتے ہیں کیا بدلہ ہے اس مزدور کا جو اپنا کام پورا کر چکا ہو وہ عرض کرتے ہیں کہ ہمارے معبود اور ہمارے مالک اس کا بدلہ یہی ہے کہ اس کی مزدوری پوری پوری دے دی جائے تو حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں کہ اے فرشتوں میں تمہیں گواہ بناتا ہوں میں نے ان کو رمضان کے روزوں اور تراویح کے بدلہ میں اپنی رضا اور مغفرت عطا کر دی اور بندوں سے خطاب فرما کر ارشاد ہوتا ہے کہ اے میرے بندو مجھ سے مانگو، میری عزت کی قسم میرے جلال کی قسم آج کے دن اپنے اس اجتماع میں مجھ سے اپنی آخرت کے بارے میں جو سوال کرو گے عطا کروں گا اور دنیا کے بارے میں جو سوال کرو گے اس میں تمہاری مصلحت پر نظر کروں گا میری عزت کی قسم کہ جب تک تم میرا خیال رکھو گے میں تمہاری لغزشوں پر ستاری کرتا رہوں گا (اور ان کو چھپاتا رہوں گا) میری عزت کی قسم اور میرے جلال کی قسم میں تمہیں مجرموں (اور کافروں) کے سامنے رسوا اور فضیحت نہ کروں گا بس اب بخشے بخشائے اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ تم نے مجھے راضی کیا اور میں تم سے راضی ہو گیا بس فرشتے اس اجر و ثواب کو دیکھ کر جو اس امت کو افطار کے دن ملتا ہے خوشیاں مناتے ہیں اور کھل جاتے ہیں۔
(فضائل رمضان)

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنْھُمْ

حق تعالیٰ کی اس ذرہ نوازی کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہم ان کے اور زیادہ فرمانبردار اور اطاعت شعار بندے بنتے تاکہ اور زیادہ ان کی رحمتوں اور برکتوں کے حقدار ہوتے لیکن افسوس ہلال عید نظر آتے ہی ہم نے ایسا رُخ پکڑا اور ایسے نکلے اور نظریں پھیریں کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا اور اتنی دور نکل گئے کہ مرکز ہی کو بھول گئے۔ اور ایسے ایسے کاموں کا ارتکاب کیا کہ جن سے بجائے مورد رحمت بننے کے حق تعالیٰ کی ناراضگی غصہ اور

عذاب کا مورد بننے لگے عید الفطر کی شب اور اس کا دن انعامات الٰہی کی وصولی اور خوشنودی حاصل ہونے کا مبارک دن ہے ہم نے اس کو ان کی ناراضگی کا سبب بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور تعجب یہ ہے کہ ہم ایسی باتوں کو گناہ بھی نہیں سمجھتے جو اور بھی خطرناک بات ہے یہاں ذیل میں کچھ ایسی ہی چند باتیں عرض کرتا ہوں صرف اس امید پر کہ شاید اللہ کا بندہ توجہ سے ان باتوں کو پڑھے اور اسے توفیق عمل ہو جائے۔
حق تعالیٰ ہم سب کو ان منکرات سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے آمین ثم آمین

مصافحہ ملاقات کے وقت ہے

سب سے پہلے مصافحہ اور معانقہ کے وقت کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ملاحظہ ہوں:

حدیث حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا یقیناً جب ایک بندۂ مومن کسی دوسرے بندۂ مومن سے ملاقات کرتا ہے تو ان دونوں کے گناہ اس طرح جھڑ جاتے ہیں جس طرح درخت کے پتے (موسم خزاں میں خشک ہو کر) گر جاتے ہیں۔ (الترغیب والترھیب ص ۴۳۳ ج ۳)

حدیث حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب دو مسلمان باہم ملاقات کرتے ہیں (اور) پھر باہم مصافحہ کرتے ہیں تو ایک دوسرے سے جدا ہونے سے پہلے پہلے ان کی مغفرت ہو جاتی ہے۔
رواہ ابوداؤد والترمذی (الترغیب والترھیب ج ۳ ص ۴۳۳)

مصافحہ سلام کا تکملہ ہے

حدیث حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے آپس میں سلام کی تکمیل (سلام کے بعد) مصافحہ کرنا ہے۔
(رواہ الترمذی مشکوٰۃ ص ۴۶۷)

حدیث حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا سلام کی تکمیل ہاتھ پکڑنا ہے۔ (یعنی مصافحہ کرنا ہے)
(رواہ الترمذی ص ۱۱۵ ج ۲)

معانقہ سفر سے آنے پر ہے

حدیث حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کسی سفر سے مدینہ منورہ آئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر تشریف فرما تھے وہ آپ سے ملاقات کے لئے آئے۔ اور دروازہ کھٹکھٹایا چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے آنے کی خوشی میں اکھلے بدن کے ساتھ (جب کہ ستر چھپا ہوا تھا) ایک چادر اپنے بدن پر ڈالتے ہوئے ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں بخدا میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حالت میں کسی کا استقبال کرتے ہوئے نہ کبھی اس سے پہلے دیکھا اور نہ کبھی اس کے بعد۔ پھر آپ نے زید بن حارثہ سے معانقہ کیا اور بوسہ لیا۔

رواہ الترمذی۔ (مشکوٰۃ ص۴۱۲)

حدیث حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے ان کے حبشہ سے واپسی کے قصہ میں منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم حبشہ سے نکلے یہاں تک کہ مدینہ منورہ پہنچ گئے پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے معانقہ فرمایا.....

رواہ فی شرح السنۃ ....(مشکوٰۃ ص۴۰۲)

مصافحہ اور معانقہ میں صحابہ کرامؓ کا عمل

حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ جب آپس میں ملاقات کرتے تو مصافحہ کرتے اور جب کسی سفر سے واپس لوٹتے تو معانقہ کیا کرتے تھے۔

رواہ الطبرانی۔ (الترغیب والترھیب ص۴۳۳ ج۳)

چنانچہ مذکورہ بالا احادیث کے تحت مرقات شرح مشکوٰۃ میں محدث کبیر حضرت ملا علی قاریؒ رحمۃ اللہ علیہ نے فرض نمازوں کے بعد مصافحہ کرنے کی تردید میں جو کچھ فرمایا ہے ملاحظہ ہو:

"بیشک شروع مصافحہ کا محل ملاقات کے شروع میں ہے بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ بغیر مصافحہ کے ملتے ہیں اور دیر تک ادھر اُدھر کی اور علم وغیرہ کی باتیں کرتے رہتے ہیں پھر جب نماز پڑھ

لیتے ہیں تو مصافحہ کرنے لگتے ہیں یہ کہاں کی سنت ہے؟ اسی
لئے ہمارے علماء نے صراحۃً لکھدیا ہے کہ یہ طریقہ مکروہ ہے اور
بدعت مذمومہ ہے۔"

مرقاۃ شرح مشکوٰۃ صـ ۷۴ ج ۹

تشریح ان کے زمانہ میں عصر و فجر کی نماز کے بعد مصافحہ کا رواج تھا جیسا کہ آج بھی اس کا رواج ہے اس لئے اسی سے منع فرمایا ورنہ جمعہ و عیدین سب نمازوں کے بعد مصافحہ کے التزام کا ایک ہی حکم ہے چنانچہ شیخ ابوالحسن بکری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ عصر و فجر کی نماز کے بعد مصافحہ کرنے کی قید اس بناء پر ہے کہ ان کے زمانہ میں اسی کی عادت تھی ورنہ جملہ نمازوں کے بعد مصافحہ کرنا ایسا ہی ممنوع سمجھئے جیسا فجر و عصر کے بعد۔

(شامی صـ ۲۴۴ ج ۵)

فقیہ اعظم علامہ شامی کی تحقیق

فقہاء متاخرین میں علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور و معروف کتاب شامی میں مصافحہ کے متعلق تفصیل سے بحث فرمائی ہے اس کے آخر میں علامہ نے جو تحقیق قلمبند کی ہے وہ نہایت واضح اور بے غبار ہے چنانچہ بعد کے تمام علماء و فقہا کی تحقیق کا مرجع یہی ہے ملاحظہ ہو۔

نماز کے بعد مصافحہ کرنا مکروہ ہے۔ کیونکہ صحابہؓ کرام نماز کے بعد مصافحہ نہیں کرتے تھے اور یہ مصافحہ اس لئے بھی مکروہ ہے کہ یہ روافض کا طریقہ ہے اور علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں یہ بڑی مکروہ بدعت ہے شریعتِ محمدی میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ اس کے کرنے والے کو پہلی دفعہ تنبیہ کی جائے نہ مانے تو دوسری دفعہ اس کو سزا دی جائے اور ابن الحاج۔ مالکی مدخل میں تحریر فرماتے ہیں، یہ بھی ایک بدعت ہے۔ شریعت میں مصافحہ کرنے کا وہ وقت بتایا گیا ہے جب مسلمان اپنے مسلمان بھائی سے ملاقات کرے نہ کہ نمازوں کے بعد لہٰذا جہاں شریعت نے مصافحہ رکھا ہے وہیں مصافحہ کرے (اس کے علاوہ دوسرے اوقات میں مثلاً نمازوں کے بعد) مصافحہ کرنے سے منع کیا جائے اور کرنے والے کو جو سنت کے خلاف عمل کر رہا ہے سختی سے روکا جائے۔ (شامی صـ ۲۴۴، ج ۵)

تشریح ان احادیث سے اور ان جیسی دیگر احادیث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ مصافحہ اور معانقہ کرنے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طریقہ یہ تھا کہ جب آپس میں ملاقات ہوتی تو پہلے سلام کرتے اور سلام کے بعد مصافحہ کرتے اور جب سفر سے آتے تو معانقہ

کرتے، مصافحہ اور معانقہ کا کوئی خاص وقت یا دن مقرر نہ تھا بس اسی طرح بالکل اسی تفصیل سے مصافحہ اور معانقہ کرنا مسنون و مستحب ہے اور کارِ ثواب ہے، اسی پر عمل کرنا چاہیئے اسے نہ کوئی روک سکتا ہے، نہ کسی کی مجال ہے، چنانچہ اگر کوئی مصافحہ اور معانقہ کو عیدین کے دن خاص عید کی وجہ سے لازم اور ضروری نہ سمجھے اور عیدین کے علاوہ سال کے باقی ایام میں بھی سنت سمجھ کر اس کا پورا اہتمام کرے اور اپنا دائمی عمل بنائے اور پھر عید کے دن اپنے سابقہ معمول کے مطابق بوقت ملاقات سلام کر کے مصافحہ کرے تو کوئی مضائقہ نہیں یا جو عزیز رشتہ دار یا دوست عید کے دن سفر سے آئے اور سفر سے آنے کی بناء پر اس سے گلے ملے تو بھی نہ صرف جائز بلکہ سنت ہے۔ رہا فرض نمازوں اور عیدین کی نماز کے بعد کا مروجہ مصافحہ اور معانقہ سو ان احادیث اور دیگر صحیح احادیث میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرض نمازوں اور عیدین کے روز التزاماً مصافحہ اور معانقہ کیا کرتے تھے، لوگوں نے اپنی طرف سے ایجاد کر لیا ہے اور سنت بنا لیا ہے بلکہ فرض و واجب کی طرح اس کی پابندی کی جاتی ہے اور اس کو ایسا ضروری سمجھ لیا گیا ہے کہ اس کے بغیر عید ہی نہیں ہوتی اور جو اس پر عمل نہ کرے اس کو طرح طرح کے طعنے دیئے جاتے ہیں حالانکہ مصافحہ و معانقہ نہ عیدین کی سنت ہے اور نہ اس کے زوائد و واجبات میں ہے تو جو چیز نہ سنتِ عیدین ہے اور نہ فرض و واجب ہے اس کو سنت قرار دینا یا فرض یا واجب کا درجہ دینا کیا اپنی طرف سے اضافہ کرنا نہیں؟ پھر اس مصافحہ و معانقہ کی شکل بھی بدل گئی ہے وہ اس طرح کہ مسنون طریقہ یہ ہے کہ ملاقات کے وقت کریں، یہاں یہ صورت ہے کہ عیدین کے روز گھر سے ایک ساتھ نکلے راستہ میں ملاقات رہی ایک ساتھ عیدگاہ گئے ساتھ بیٹھے ساتھ نماز پڑھی پھر جب نماز اور خطبہ سے فارغ ہوتے ہیں تو مصافحہ اور معانقہ شروع ہو جاتا ہے اور اس پر غضب یہ ہے کہ اکثر سلام بھی نہیں کرتے بس گلے ملے اور سلام کی جگہ عید مبارک کہہ کر فارغ ہوئے اور اسی کو کافی سمجھتے ہیں غور کیجیے؟ کیا دین کو بدلنا نہیں ہے اس لئے اس سے منع کیا جاتا ہے۔

محدثِ کبیر حضرت ملا علی قاریؒ کی تحقیق

بہر حال چونکہ عیدین اور فرض نمازوں کے بعد اس مروجہ مصافحہ معانقہ کا کوئی ثبوت نہیں ہے اسی لئے فقہاء و محدثین رحمہم اللہ نے اپنے اپنے زمانہ میں اس کی تردید فرمائی ہے اور اس سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔

اور معانقہ کے متعلق "المدخل" میں تصریح ہے۔

فرماتے ہیں رہا عیدین کا معانقہ سو حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ نے اس کو مکروہ قرار دیا ہے اور حضرت ابن علیینہ رح نے کچھ دن کے بعد ملاقات ہونے پر معانقہ کی اجازت دی ہے لیکن جو شخص تمہارے ساتھ عید کے دن نمازِ عید میں حاضر ہے اس سے معانقہ کرنے کی اجازت نہیں (ص ۹ ۲، ج ۲)

ایک شبہ کا ازالہ

یہاں یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ شاید کسی صاحبِ علم کو علماء سلف کے ان بعض اقوال سے شبہ ہو جن میں انہوں نے فرض نمازوں کے بعد مصافحہ کے رواج کو بدعتِ مباحہ قرار دیا ہے لہٰذا جائز ہے۔

واضح رہے کہ اوّل تو بدعتِ مباحہ کہنے سے اتنی بات خود ہی واضح ہوگئی کہ اس موقع پر ہونے والا مصافحہ ان کے نزدیک بھی سنت نہیں ہے اور سنت ہو بھی کیسے سکتا ہے جب ثابت ہی نہیں اور ایک امتی کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور طریقہ چاہیئے کیونکہ آپ کا راستہ ہی راہِ ہدایت ہے

دوسرے یہ کہ علماء محققین نے ان اقوال کو اختیار نہیں کیا بلکہ صراحۃً ان کی تردید فرمادی جیسا کہ ابھی اوپر حافظ ابن حجر اور علامہ شامی کی تحقیق سے ثابت ہوا نیز ہند و پاک کے محقق علماء، فقہا نے بھی انہیں قبول نہیں کیا جیسا کہ عنقریب آرہا ہے۔ لہٰذا ان سے استدلال کرنا درست نہیں۔

ہند و پاک کے علماء کے فتاوٰی

اب ہند و پاک کے اکابر علماء اور مفتیوں کے فتاوٰی ملاحظہ ہوں سب اس پر متفق ہیں کہ عیدین کی نماز کے بعد اور فرض نمازوں کے بعد جو مصافحہ اور معانقہ رائج الوقت ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا فتوٰی

عیدین میں مصافحہ و معانقہ بدعت ہے

سوال، معانقہ کرنا بالخصوص عیدین کے روز کس درجہ کا گناہ ہے۔ مکروہ ہے یا حرام؟

جواب، معانقہ و مصافحہ بوجہ تخصیص کے کہ اس روز میں اس کو موجبِ سرور اور باعثِ مودت اور ایام سے زیادہ مثل ضروری کے جانتے ہیں بدعت ہے اور مکروہ تحریمی ہے اور علی الاطلاق ہر روز مصافحہ کرنا سنت ہے ایسا ہی بشرائط خود یوم العید کے ہے اور علیٰ ہٰذا معانقہ جیسا بشرائط خود دیگر

ایام میں ہے ویسا ہی یوم عید کے ہے کوئی تخصیص اپنی رائے سے کرنا بدعت ضلالہ ہے فقط واللہ اعلم
رشید احمد عفی عنہ'

(فتاوی رشیدیہ کامل ص ۱۰۲)

سوال : عیدین میں معانقہ کرنا اور بغلگیر ہونا کیسا ہے للہ ان مسئلوں کو زیب قلم فرما کر مزین بمہر فرمادیں فقط
جواب : عیدین میں معانقہ کرنا بدعت ہے فقط واللہ تعالیٰ اعلم کتبہ احقر بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ
الجواب صحیح محمد عبد اللطیف عفی عنہ ۔

(فتاوی رشیدیہ کامل ص ۱۴۰)

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح کا فتویٰ

نماز عیدین کے بعد مصافحہ ومعانقہ بدعت ہے ۔

سوال : عیدین میں مصافحہ ومعانقہ روا ہے یا نہیں ؟
جواب : قاعدہ کلیہ ہے کہ عبادات میں حضرت شارع علیہ السلام نے جو ہیئت وکیفیت معین فرمادی ہے اس میں تغیر وتبدل جائز نہیں اور مصافحہ چونکہ سنت ہے اس لئے عبادات میں سے ہے تو حسب قاعدہ مذکورہ اس میں ہیئت وکیفیت منقولہ سے تجاوز جائز نہ ہوگا اور شارع علیہ السلام سے صرف اول لقاء کے وقت بالاجماع یا وداع کے وقت بھی علی الاختلاف منقول ہے پس اب اس کے لئے ان دو وقتوں کے سوا اور کوئی محل وموقع تجویز کرنا تغییر عبادت کرنا ہے جو ممنوع ہے لہٰذا مصافحہ بعد عیدین یا بعد نماز پنجگانہ مکروہ وبدعت ہے شامی میں اس کی تصریح موجود ہے ، فقط واللہ اعلم

(امداد الفتاوی جلد اول ص ۴۵۶)

حضرت مفتی عزیز الرحمن رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ

نماز عیدین کے بعد مصافحہ مکروہ ہے

سوال : نماز عیدین کے بعد مصافحہ ومعانقہ آپس میں کرنا سنت سے ثابت ہے یا نہیں ثابت ہے ؟
جواب : نماز عیدین یا دیگر نمازوں کے بعد تخصیص مصافحہ کی کرنا اور اسی وقت خاص میں اس کو سنت جاننا اور معمول بہ ٹھہرانا بعض فقہاء نے منع لکھا ہے اور مبین الکلام میں اس کو روافض کے طریقہ سے لکھا اور مکروہ فرمایا ہے ۔

رفتار کار

سہ روزہ علاقائی اجتماع حلقہ سندھ وبلوچستان

تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع میں یہ طے ہوا تھا کہ آئندہ سال مختلف حلقوں میں سہ روزہ علاقائی اجتماعات منعقد کئے جائیں گے۔ اس فیصلے کی روشنی میں پہلا سہ روزہ علاقائی اجتماع حلقہ سندھ وبلوچستان ۱۴ تا ۱۶ جنوری قرآن اکیڈمی کراچی میں منعقد ہوا۔ اس کے ساتھ ہی چار روزہ ملتزم و مبتدی تربیت گاہ بھی رکھی گئی تاکہ جو رفقاء ملتزم یا مبتدی تربیت گاہ میں شریک ہونا چاہیں انہیں الگ سے سفر نہ کرنا پڑے۔ حلقوں کے علاقائی اجتماعات کی افادیت مسلم ہے' اس لئے کہ ایک حلقہ کے لوگوں کا آپس میں مل بیٹھنا اور ایک ساتھ اجتماعی پروگراموں میں شرکت کرنا' ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنا اور ان سے تعارف حاصل کرنا سالانہ اجتماع کے مقابلے میں نسبتاً آسان ہے۔ تنظیم کی طرف سے ہر رفیق کو مہینے میں دو یوم فارغ کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ یہ دو یوم اپنے حلقے میں دعوتی پروگرام میں صرف ہوں تو اس اجتماع کا یہ فائدہ بھی ہوگا کہ اس میں شرکت سے رفقاء کا تعارف وسیع پیمانے پر ہوگا اور جب بھی وہ کسی علاقے میں دعوتی پروگرام کے لئے جائیں گے تو اجنبیت کا احساس نہ ہوگا اور وہ محسوس کریں گے کہ وہ اپنے ہی لوگوں کے پاس ہیں۔ ہر علاقے کے ناظم کو بھی اپنے رفقاء کی قوت کار کا اندازہ ہو جائیگا اور آئندہ پروگرام بنانے میں وہ اس کو پیش نظر رکھے گا۔ پھر ناظم حلقہ کا ہر رفیق سے ذاتی تعارف ہوگا۔ غرضیکہ ہر اعتبار سے اس کی افادیت مسلم ہے۔

حلقہ سندھ وبلوچستان کا یہ اجتماع جمعہ ۱۴ جنوری بعد نماز فجر منعقد ہو رہا تھا' اس لئے دور دراز کے رفقاء تو ۱۳ جنوری کی شام ہی کو پہنچنا شروع ہو گئے۔ یہ سلسلہ رات دیر تک جاری رہا۔ ۱۳ جنوری کو امیر محترم کی آمد تھی' آپ عمرہ ادا کر کے تشریف لا رہے تھے' لہٰذا تنظیم کی مجلس عاملہ کی میٹنگ بھی اسی دن رکھی گئی تھی۔ عاملہ کے ارکان تشریف لا چکے تھے۔ امیر محترم بعض وجوہ سے وقت پر نہ پہنچ سکے' اس لئے مجلس عاملہ کی صدارت ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے کی۔ قرآن اکیڈمی کے دروازے سے متصل استقبالیہ تھا جہاں رفقاء اپنی آمد کا اندراج کراتے تھے۔ وہیں مکتبہ بھی لگایا گیا تھا۔ حلقہ کی طرف سے رفقاء کو بیج فراہم کیا جاتا اور ایک سہ ورقہ بھی جس میں ناظم حلقہ کی طرف سے خوش آمدید کہا گیا تھا اور پورے پروگرام کی تفصیل درج تھی۔ آخری صفحہ پر "گزارش" کے عنوان سے اختتام اجتماع پر آراء اور تجاویز دینے کی درخواست کی گئی تھی۔

جمعہ ۱۴ جنوری بعد نماز فجر اس علاقائی اجتماع کا افتتاح کرتے ہوئے جناب نسیم الدین صاحب ناظم حلقہ سندھ و بلوچستان نے رفقاء کو خوش آمدید کہا' نیز بعض اہم باتیں ان کے گوش گزار کیں۔ اس کے فوری بعد جناب حافظ عاکف سعید صاحب نے درس حدیث دیا۔ درس کے اختتام پر اعلان ہوا کہ اب آپ لوگ اکیڈمی کے لان میں تشریف لائیں جہاں جسمانی ورزش کا پروگرام تھا' جس کا دورانیہ صرف ۲۰ منٹ تھا۔ تنظیم اسلامی کے رفقاء کے لئے یہ نئی بات تھی' چنانچہ سبھی ایک خوشگوار حیرت سے دوچار تھے۔ رفقاء قطار در قطار کھڑے ہو گئے' جناب شمس الحق اعوان صاحب نے اس کی اہمیت پر مختصر اظہار خیال کیا اور ہلکی پھلکی پی ٹی کی تربیت دی۔ یہ بھی تربیت کا ایک حصہ تھا۔ تنظیم اسلامی جو کام لے کر اٹھی ہے وہ علمی و فکری کے ساتھ عملی اور جسمانی بھی ہے۔ ہمارے پروگرام میں مظاہرے بھی شامل ہیں اور اس کے لئے مشقت کی تربیت بھی ضروری ہے۔ دعوت کے ساتھ جسمانی اعتبار سے بھی اپنے کو تیار کرنا حضور ﷺ کی ایک بڑی سنت ہے۔ کسی بھی تحریک کے لئے برداشت ذہنی اور برداشت جسمانی دونوں اہم ہیں' بیعت کے نظام میں ہم نے برداشت کا عہد بھی کیا ہے۔ یہ برداشت تزکیہ نفس کے لئے تریاق ہے اور اجتماعیت کی کامیابی کی کلید ہے۔

صبح ۹ بجے جناب رحمت اللہ بٹر صاحب نے فرائض دینی کے جامع تصور پر گفتگو کی۔ یہ تصور ہی تو ہے جو انسان میں حرکت و عمل پیدا کرتا ہے یا اسے جمود کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ جب سے دین و دنیا کی تقسیم ہوئی اور مذہب کے نام سے ایک خاص شکل وجود میں آئی حرکت و عمل سرد پڑ گیا اور عبادت ایک محدود دائرے میں مقید ہو گئی۔ صدیوں کے انحطاط نے اسے ایسا پختہ کر دیا کہ اب دین کا انقلابی تصور اجنبی بن گیا' جہاد قصہ پارینہ ہو گیا' غزوات قصہ کہانیاں بن گئیں۔ اس چیز کو صرف تاریخ کا حصہ سمجھ لیا گیا اور امت کی رہنمائی سے خارج کر دیا گیا۔ ظلم پر ظلم یہ ہوا کہ کتاب اللہ بھی محض تلاوت و برکت کی کتاب بن گئی' دین کو قائم کرنے کی جدوجہد کو فرائض کے خانے سے نکال دیا گیا۔ چنانچہ اب اس کے لئے کون کوشش کرے؟ صرف یہی نہیں ہوا بلکہ اب تو اس کو سنت کی حیثیت بھی نہیں دی جاتی۔ تمام سنتیں بیان کی جاتی ہیں مگر اس اہم سنت کو کوئی سنت نہیں سمجھتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ فرض صرف اسی دور کے لئے تھا۔ صرف حضور ﷺ اور آپؐ کے ساتھیوں پر دین کا قیام فرض کیا گیا تھا' جہاد و قتال کی آیتیں اسی دور کے لئے کار آمد تھیں۔ حدود کا نفاذ بھی چند سالوں کے لئے تھا۔ اسلامی احکام کی تفصیلات کیا محض زیب داستان کے لئے اتری ہیں یا کوئی دوسری مخلوق آئے گی جو اس پر عمل کرے گی؟۔

اس دور میں ایک بڑے دانشور نے فلسفہ "اعراض" پیش کیا ہے۔ صلح حدیبیہ ہی ان کا "ماڈل" ہے جبکہ حضور کی پوری سیرت "ماڈل" بننی چاہئے۔ دین کے قیام کی جدوجہد کے راستے

میں صلح حدیبیہ کا مقام بھی یقیناً آئے گا مگر یہ منزل نہیں ہے' یہ تو راستے کا ایک نشان ہے۔ اس دانشور کو یہ نظر نہیں آیا کہ اسی صلح حدیبیہ کی تجدید کیوں مسترد کر دی گئی۔ اگر یہی سب کچھ تھا تو اس کی تجدید مزید کی جاتی۔ اس فلسفہ "اعراض" نے ہمارے بہت سے دینی ذہن رکھنے والے افراد کو متاثر کیا ہے۔ کام نہ کرنے کے لئے گوشہ عافیت کی یہ ایک دوسری شکل ہے۔ فلسفہ "اعراض" دراصل دین سے اعراض کا فلسفہ ہے۔ یہ تو میں کچھ اپنی بات کر بیٹھا' جناب رحمت اللہ بٹر صاحب نے قرآن حکیم کی محکم آیات سے استدلال کرتے ہوئے اس مضمون کو بہت عمدہ انداز میں بیان کیا جو مختصر بھی تھا اور جامع بھی۔

جمعہ کے خطبہ کے لئے جب امیر محترم تشریف لائے تو مسجد کا ہال بھر چکا تھا۔ رفقاء کے علاوہ دور و نزدیک سے آنے والے حضرات آپ کو سننے کے منتظر تھے۔ آپ کے خطاب میں دعوت' انذار و تبشیر اور آخر میں حالات حاضرہ پر ایک مبسوط تبصرہ ہوتا ہے۔ دعوت کے ضمن میں آپ نے فرمایا کہ اسلام ایک مکمل دین ہے' ایک مکمل نظام حیات ہے' وہ اپنی مکمل بالادستی چاہتا ہے۔ اپنے ماننے والوں سے اس کا مطالبہ ہے کہ وہ اس کے لئے تن' من' دھن لگا دیں۔ اپنی ذات تک محدود رکھنے والا تقویٰ' تقویٰ نہیں ہے۔ تقویٰ کا تقاضا ہے کہ وہ اس ہدف کی طرف بڑھے جسے دین نے مقرر کیا ہے' یعنی اعلائے کلمۃ اللہ یا دوسرے لفظوں میں اقامت دین۔ وہ باہمت لوگ جو اسے قبول کرتے ہیں وہ ہر قسم کے موانع کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔ کم ہمت لوگ دعوت حق کو قبول کرنے کے بعد پسپائی اختیار کرتے ہیں جسے ارتداد معنوی کہا جا سکتا ہے۔ راہ حق کے ساتھیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس راستے پر چلنے والے باہم محبت و اخوت کے رشتے میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ آپس میں نرم خو اور دشمن کے لئے سخت تر ہوتے ہیں۔ اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ اللہ نے ان لوگوں کو چن لیا ہے' انہیں بھی چاہئے کہ اس توفیق کی ناقدری نہ کریں۔ اس توفیق کی جتنی قدر کرو گے اسی قدر مزید توفیق ملے گی۔ حالات حاضرہ کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے سابقہ اور موجودہ امت مسلمہ کا تقابل کیا' اور آنے والے سخت ترین عذاب' جس کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے ہیں' کے بارے میں متنبہ کیا کہ اب بھی وقت ہے' اگر یہ امت اجتماعی توبہ کرے تو اللہ پھر ان پر نظر کرم کر سکتا ہے۔

بعد عصر ناظم اعلیٰ جناب ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے تنظیم اسلامی کا تاریخی پس منظر بیان کرتے ہوئے تاریخ اسلام کا مختصر جائزہ پیش کیا۔ بعد مغرب جناب نوید احمد صاحب نے درس قرآن دیا۔ سورۃ العصر' جسے منتخب نصاب کی بسم اللہ کی حیثیت حاصل ہے' اس کی تشریح فرمائی اور کرنے کے اصل کام کی طرف متوجہ کیا۔ بعد نماز عشاء جناب اعجاز لطیف صاحب نے سیرت صحابہؓ میں سے زید بن حارثہؓ اور مصعب بن عمیرؓ کا ذکر کیا اور ان کے حالات سے سامعین کے قلوب کو

گرمایا۔ ہمارے لئے ان حضرات کے ذکر سے عزم و عمل کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ لوگ یقیناً روشنی کے مینار تھے اور رہتی دنیا تک ان کی روشنی نشان منزل کا پتہ بتاتی رہے گی۔

دوسرے دن کے اہم پروگراموں میں توسیعی مشاورت کا انعقاد تھا۔ یہ علاقائی توسیعی مشاورت تھی جس کے حدود کار کا تعارف ناظم اعلیٰ نے کرایا۔ اس مشاورت کے اصل سامع امیر محترم کے علاوہ جملہ ارکان عاملہ ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو کسی بھی پہلو سے اپنے اندر شکوک و شبہات رکھتے ہیں وہ انہیں بلا کسی جھجک کے بیان کرتے ہیں' خواہ امیر محترم کی ذات سے متعلق کسی قسم کا کوئی سوال ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح تنظیم کے طریقہ کار اور اس کی پالیسی کے متعلق جو بھی وضاحت مطلوب ہوتی ہے اس مجلس میں بے دھڑک بیان کی جاتی ہے۔ یہ انداز صرف تنظیم اسلامی نے اختیار کیا ہے جسے فیڈ بیک کا نظام کہا جاتا ہے۔ رفقاء کی آراء معلوم ہوتی ہیں' ان کی سوچ کے رخ کا پتہ چلتا ہے' تنظیم کے اندر کس قسم کی باتیں نفوذ کر رہی ہیں اس کی نشاندہی ہوتی ہے۔ پھر اشکالات کھل کر سامنے آتے ہیں' غلط فہمیوں کی گرہیں کھلتی ہیں۔ رفقاء میں سے ۱۲ آدمیوں نے مختلف پہلوؤں کو اپنی گفتگو کا موضوع بنایا۔ مشترک باتوں میں دین کے باطنی پہلو پر زور اور تنظیم میں نظم کو مزید بہتر بنانے کے لئے بعض تجاویز شامل ہیں۔ ہر سطح پر کام کرنے کے لئے پروگراموں کے انعقاد کی ضرورت کی طرف بھی توجہ دلائی گئی۔ مزید برآں جذبہ انفاق کو ابھارنے کی ضرورت کا احساس بھی دلایا گیا۔ رفقاء نے جب اپنی بات مکمل کر لی تو امیر محترم نے فرمایا کہ علاقائی اجتماع کے انتظام کو دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی ہے اور اطمینان بھی۔ اس اجتماع کے انعقاد پر محنت کی گئی ہے اور خاص طور سے جناب نسیم الدین صاحب ناظم حلقہ سندھ و بلوچستان نے بھرپور محنت کی ہے جو قابل مبارک باد ہے۔ اس حوصلہ افزائی پر ہم امیر محترم کے ممنون ہیں' رفقاء کراچی کی محنت یقیناً بار آور ہوئی ہے اور ان شاء اللہ اس سے دعوت کے کام کو آگے بڑھنے میں مدد ملے گی۔ پھر آپ نے فرمایا کہ مشورہ میری ضرورت ہے' اور مشورہ کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ میں کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے اپنے قریبی رفقاء سے مشورہ کرتا ہوں' اس ٹیم کا نام مجلس عاملہ ہے۔ پھر مجلس مشاورت میں اس مسئلے کو رکھتا ہوں اور ان تمام افراد کی رائے سے مستفید ہوتا ہوں۔ اسی طرح یہ توسیعی مشاورت بڑے پیمانے پر رفقاء کی رائے سے آگاہ ہونے کے لئے ہے۔ جہاں تک باطنی پہلو کا تعلق ہے تو ہمارا نظام تزکیہ' تزکیہ بالقرآن ہے۔ قرآن مجید کو اپنے اندر اتارنے سے ہی وہ جذبہ پیدا ہو گا جو انسان کو صراط مستقیم پر قائم رکھ سکے گا اور اقامت دین کے راستے کی کٹھنائیوں میں سہارا بنے گا۔ یہ نشست صبح ۹ بجے سے دوپہر ایک بجے تک رہی۔

بعد نماز عصر جناب مختار حسین فاروقی صاحب نے درس قرآن مجید دیا۔ آپ نے سورۃ الحج کے حوالے سے جہاد بالقرآن کی وضاحت کی۔

اخباری اعلان کے مطابق بعد مغرب امیر محترم کو موجودہ اور سابقہ مسلمان امتوں کے ماضی' حال اور مستقبل پر تقریر کرنی تھی۔ رفقاء کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اس خطاب کو سننے کے لئے تشریف لائے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اس موضوع پر میں متعدد خطاب کر چکا ہوں۔ دنیا کی تاریخ میں دو ہی مسلمان امتیں رہی ہیں' ایک سابقہ مسلمان امت بنی اسرائیل اور دوسری موجودہ امت مسلمہ یعنی امت محمد ﷺ۔ ان دونوں امتوں کی تاریخ میں حیرتناک حد تک مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس مشابہت کو حضور ﷺ نے اپنی ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے کہ جس طرح جوتے کی جوڑی باہم مشابہ ہوتی ہے اسی طرح ان دونوں میں مشابہت ہے۔ آپ نے تاریخ بنی اسرائیل اور تاریخ امت محمدیہ کا ایک تقابلی مطالعہ لوگوں کے سامنے رکھا۔ ان میں عبرت کے جتنے پہلو بھی ہو سکتے ہیں بیان فرمائے۔ آپ نے فرمایا کہ دراصل کتابیں تو دو ہی ہیں جو ان دو امتوں کو دی گئیں یعنی تورات اور قرآن جن میں شریعت کے تفصیلی احکام ہیں۔ انجیل تو وعظ و نصیحت پر مشتمل کتاب تھی اور زبور کی حیثیت ایک ترانہ حمد کی تھی۔ موجودہ حالات جس رخ پر جا رہے ہیں اس کی ہولناکی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ عربوں پر عذاب آیا ہی چاہتا ہے اور انہیں اللہ کی کتاب سے بے اعتنائی کی سزا مل کر رہے گی۔ اسی طرح دوسرے نمبر پر اہل پاکستان ہیں۔ اگر اہل پاکستان نے اجتماعی توبہ نہ کی تو یہ بھی عذاب سے نہ بچ سکیں گے۔ اس کے بعد وہ عظیم جنگ برپا ہو گی جس کی خبر احادیث میں دی گئی ہے۔ یہی وہ وقت ہے ہو گا جب بنی اسرائیل پر عذاب استیصال آئے گا اور اللہ کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔

ہمارے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم توبہ کی منادی کریں کیونکہ اللہ کی طرف سے انہی لوگوں کی نجات کا وعدہ ہے جنہوں نے برائی کو ہاتھ یا زبان سے روکنے کی کوشش کی ہو گی۔ امیر محترم کی یہ بات سب کے لئے ایک انتباہ ہے لیکن ہم بحیثیت قوم اپنی دنیا بنانے میں مگن ہیں۔ آپ اگر کسی سے ان باتوں کا ذکر کریں تو اس کا پہلا ردعمل لاپرواہی اور نظرانداز کرنے کا ہو گا' پھر وہ کہنے والے کو ملامت بھری نظروں سے دیکھے گا کہ اس احمق کو کیا پڑی ہے جو ہمیں نصیحت کر رہا ہے' پھر وہ گردن گھما کر دوسری سمت چل دے گا۔ واقعہ "سبت" میں ہمیں یہ نقشہ ملتا ہے کہ ایک گروہ برائی میں منہمک تھا' دوسرا گروہ برائی کرنے والوں کو وعظ و نصیحت کے ذریعے برائی سے باز رہنے کی تلقین کرتا تھا' اور تیسرا گروہ جو بظاہر غیر جانبدار تھا' دوسرے گروہ سے کہتا تھا کہ تم خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہو' یہ لوگ نصیحت پکڑنے والے نہیں ہیں۔ لیکن جب اللہ کا عذاب آیا تو وہ گروہ بچا لیا گیا جس نے اپنی حد تک برائی کو روکنے کی کوشش کی تھی اور بقیہ دو گروہ ہلاک کر دیئے گئے۔ قرآن مجید نے یہ واقعہ زیب داستان کے لئے نہیں بیان کیا ہے' اس میں قیامت تک کے لئے رہنمائی ہے۔

اجتماع کے تیسرے اور آخری دن معمول کے پروگرام کے علاوہ امیر محترم کی ایک تقریر اور سوال و جواب کی ایک نشست تھی۔ تقریر ایک حدیث کی توضیح و تشریح پر مشتمل تھی جسے حدیث جبریل کہا جاتا ہے اور جس میں اسلام ایمان اور احسان کی تعلیم دی گئی ہے۔ آپ نے اس پر دو گھنٹے سیر حاصل گفتگو فرمائی اور حقیقت اسلام، حقیقت ایمان اور حقیقت احسان کی وضاحت فرمائی۔ تنظیم اسلامی کا دعوت کا جو طریقہ کار ہے وہ منہج انقلاب نبوی ؐ سے اخذ کیا گیا ہے، اس راستے کے پیچ و خم کا استحضار اور اس کا شعور بیدار رکھنے کے لئے ان اجتماعات میں اس کا اعادہ ضروری ہے۔ اس موضوع پر جناب شمس الحق اعوان صاحب نے تقریر فرمائی۔ بعد مغرب سوال و جواب کی بھرپور نشست ہوئی۔

عشاء کے بعد نئے رفقاء سے بیعت لی گئی۔ یہ قول و قرار کا منظر بھی خوب ہوتا ہے۔ اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے قول و قرار، اس کے راستے میں مال و جان کھپانے کا قول و قرار۔ اس آسمان کے نیچے اور اس زمین کے اوپر اس سے زیادہ عظیم بالشان قول و قرار کوئی نہیں۔ قول و قرار لینے والے کو خوب معلوم ہے کہ وہ کس بات کا اقرار لے رہا ہے، کیونکہ اس کے سر ایک ایک فرد کی ذمہ داری ہے۔ جو اقرار کر رہے ہیں انہیں بھی جان لینا چاہئے کہ آج سے ان کی دنیا بدل گئی ہے، ان کے اہداف بدل گئے ہیں، ان کے صبح و شام بدل گئے ہیں، وہ عام آدمی نہیں رہے بلکہ ایک مقصد کے علم بردار بن گئے ہیں۔ اس روئے زمین پر خیر کو برپا کرنا اب ان کا مقصد زندگی بن گیا ہے۔ دنیا میں اگر کوئی کشش ہے بھی تو وہ آخرت کے لئے ہے۔ آخرت جو یقینی ہے، حتمی ہے، شدنی ہے، آکر رہے گی، ہماری تمام صلاحیتوں اور توانائیوں کی سرمایہ کاری اسی کے لئے ہے۔ انہیں جان لینا چاہئے کہ وہ آج سے سمع و طاعت فی المعروف کے نظم میں پرو دیئے گئے ہیں۔ اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے اگر جذبات میں طلاطم ہے تو وہ بہت مبارک ہے۔ اس دھڑکتے والے دل کی ایک ایک دھڑکن توشہ آخرت بن رہی ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اس راہ کی صعوبتوں کو جھیلنے کے لئے میدان کارزار میں مردانہ وار اتر گئے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ۔

کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موج دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

اس سہ روزہ اجتماع میں شریک ہونے والوں کے لئے تنظیم اسلامی حلقہ سندھ و بلوچستان کی طرف سے نئے سال کی ایک خوبصورت ڈائری تحفہ کے طور پر پیش کی گئی۔ اس اجتماع میں شرکاء کی تعداد تقریباً ۷۰۰ تھی۔

(مرتب : نجیب صدیقی)

incarnate of the nation. It is expected of it that it may not even seem to be arbitrary, capricious or inconsistent.

This is a situation which can hardly be described as satisfactory, because it is fraught with confusion, perplexity, and quizzical ungainliness. The fact is that we find here unmistakable symptoms of something deeper. I would venture to say that the root of the problem lies in the lurking and at times diplomatically unexpressed fears, doubts, misgivings, and mental reservations regarding relevance of Islam to the modern context. There is a feeling, it appears that if Islamic Shariah is applied not partially and selectively but as a whole it might lead to disruptive if not disastrous consequences. It is, therefore, true to say unless these doubts and fears are convincingly dispelled and assuaged the situation that presently prevails will continue to persist. In this respect I am somewhat handicapped because constraints imposed by the topic under discussion do not allow adequate analysis of Islamic law, which is a vast subject. However, fortunately it so happens, that here even brief cursory and thus inevitably superficial description of the fundamentals of Islamic law can serve the purpose to a great extent. Such a description can establish that in view of the unusual in-built adaptability of the Islamic law, all above-mentioned fears and doubts are quite misconceived and unfounded. In fact it would become clear that the entire blame can be laid at the door of inadequate understanding and insufficient familiarity of the Islamic law and principles.

*

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

the enforceability of Article 2-A would not make any difference. For instance all the political and financial questions which according to the court are difficult to be handled by the court are already within their jurisdiction without Article 2-A, e.g. Political Parties Act, laws relating to election matters, laws relating to all financial and fiscal matters (after expiry of exemption period fixed by the constitution) belongs to sub-constitutional field, and very much open to challenge on the basis of repugnancy to Islam or even repugnancy to fundamental rights. To take one example, perhaps the most intricate and brain teasing questions of the type mentioned above relates to banking interest and interest on loan in general. It is already being scrutinized by the courts without involving any application of Article 2-A. The jurisdiction available to courts under Article 203 D is extremely wide. On the strength of it as we have found in Qazalbash Waqf case, a long row of constitutional articles including Article 253 can be rendered nugatory and this task was accomplished not by Federal Shariat Court but by the Supreme Court itself.

It is interesting to note that on an earlier occasion the Supreme Court had already expressed an opinion on these concepts which is diametrically and dramatically different from the one in Hakim Khan's case. In [39]B.Z. Kaikaus case, the Supreme Court expounded the following view: "Principles of Islam are neither hidden nor complicated nor involved nor impracticable. Islamic law is capable of being enforced, practiced, applied and adopted at all times and places, only if understood and interpreted in its true spirit keeping in view environment and circumstances of situation at a relevant time". It is easy to see that the view in Hakim Khan's case regarding these concepts represents a change of 180 degrees from the view in Kaikaus case but it has not been supported therein by any reasoning or analysis whatsoever. Supreme Court is the reason and conscience

39 B.Z Kalikaus V. The President of Pakistan. P.L.D. 1980 S.C.160

expressed his considered opinion that outwards form and function of an Islamic State need not necessarily correspond to any "Historical precedent". According to him all that is required is that an Islamic State in its constitution and practice must embody certain clear cut unambiguous ordinances of Islam. But he says "those ordinances are very few and are very precisely formulated and they are invariably of such a nature as to allow the widest possible latitude to the needs of any particular time and social conditions."

The second cause of anxiety for the Supreme Court is that the enforceability of Article 2-A would require application of concepts that are rather vague, general, flexible, concepts which are capable of different interpretation at different times, which would make the constitution unstable and uncertain. At another occasion the court has described these concepts as nebulous, undefined, controversial concepts of the Islámic Fiqah. The court has gone on to opine that the ascertainment of principles of Islamic Law on political and financial questions requires detailed study and thorough research and meaningful debate before acquiring concrete shape so as to be adopted as a test of repugnancy of the constitutional provision. It cannot be summarily done. Such an exercise can more properly be undertaken under the control and supervision of the or legislature expert bodies like the Islamic Advisory Council and Islamic Research Institute.

It is difficult to see how all this is relevant and applicable to the enforceability of Article 2-A. As we have explained already above, most of the main features of the Pakistan's constitution have been authoritatively settled by the Objectives Resolution itself. As regards the rest, we have also explained above the constitutional theory and practice of Islam. Islam allows unusual degree of flexibility and there can be hardly any problem due to this factor, what remains after this, is already subject to the scrutiny of the courts under Article 203 D read with Article 203 B(c) and as such

consistent "Ijma" of both Ulema and Islamic Umma of Pakistan, it is hard to understand how and when any occasion would arise for changing any provision of the present constitution due to Article 2-A which is itself based on objectives resolution. A sword can be used against other swords and objects but it cannot be used against itself. Furthermore it needs to be remembered that there is an unusual degree of flexibility in the constitution principles of Islam which enables them to be adjusted according to the dictates of different times and circumstances. This is amply borne out by the fact that in the case of first four Caliphs, who are designated rightly guided Caliphs of Islamic history, four different methods were used for choosing them. Islam has taken on the whole an extremely pragmatic view of the ruler's functions and the structure of the State. It is significant that the Prophet (S.A.W.) who spoke of so many things - down to smallest detail of everyday life, had little to say on government as such and showed no interest in political theorising. As far as the Holy Quran is concerned, only a small proportion of it deals with legal matters, commands and prohibitions. There is next to nothing which can be relevant to constitutional questions involved here. Thus we find that in Islamic system of law, there is deliberate and well-planned fluidity regarding these matters. We can see here another evidence of Divine wisdom and far sight. As such wide scope has been left for change and adaptations to requirements of different times till eternity. This being the case there is hardly and justification for entertaining any kind of fear or doubt relating to repugnancy of present constitutional arrangement in Pakistan with principles and Injunctions of Islam.

That there is hardly any cause for concern on this account has been eloquently and trenchantly explained by Mr. Justice Dr. Nasim Hasan Shah himself in his Article entitled "[38]Concept of an Islamic State". Therein he has

38 Mr. Justice Dr. Nasim Hasan Shah, "Concept of an Islamic State" P.L.D. 1989 Journal 125

Clause 6 and 9 together safe-guard the legitimate interests and freedom to practice religion and develop their culture to minorities, and backward and depressed classes.

Clause 7 prescribed federal form of Government alongwith provincial autonomy. This extremely modern idea of a complex form of State has been solemnly adopted with all the details and complications which it necessarily entails.

Clause 8 guarantees, a wide spectrum of fundamental rights that are a hall mark and a pride of any advanced modern liberal democracy.

Clause 10 ensures full implementation of independence of judiciary. We have already noted that according to objectives resolution authority is to be exercised through assemblies of elected people. It is implied therein that these assemblies will produce the executive head of the State alongwith his cabinet and also that it will conduct the business of law making for the nation. This fact coupled with independent judiciary indicates although in an embryonic form the idea of trichotomy of powers or at least the fact that the idea of trichotomy of powers can easily be accommodated in this frame work.

Clause 12 enjoins the making of full contribution towards international peace and progress and happiness of humanity. Thus the State of Pakistan is required to play its due role amongst the comity of nations in the conditions prevailing in the modern international milieu.

Within the structure of ideas and institutions prescribed by above provisions, clause 4 makes it absolutely certain that the State of Pakistan will be fully democratic republic even in the modern sense. Of course, there are some characteristic peculiarities of the Islamic system but they are bound to be there in the case of every nation and culture. These peculiarities are dictated by the ideology of each nation. However, in view of the features discussed above which are a part and parcel of the objectives resolution and

non-sequitur. In my humble view the whole matter turns on one question. The question is if the legislative body can limit its own legislative powers by means of a constitution of its own creation, and confer the power on judiciary to see that these limits are observed; why cannot it impose on itself the no limits prescribed by Allah the divine and actual sovereign, and confer the power on judiciary to see that these limits are also observed?. In fact, this is what the legislature has purported to do through insertion of Article 2-A in the constitution.

OBJECTIVES RESOLUTION AND CHALLENGE TO CONSTITUTION:

In Hakim Khan's case the Supreme Court has reinforced its main argument with certain ancillary and supporting arguments. One of these arguments is that if the Article 2-A is given effect to almost all constitutional provisions would become challengeable and thus the entire constitution may have to be re-written. Article 2-A would open the flood gates that the fear expressed by the Supreme Court has no foundation in fact or reality. For this purpose a minute examination of objectives resolution as incorporated in the Annex of Article 2-A would have to be undertaken. In pursuance of this, a clause by clause analysis is given as follows.

Clause 2 indicates that the state of Pakistan will be run according to a written constitution which is to be framed by a constituent assembly. Thus we can see that the modern idea of a constituent assembly implies the principle of law-making through representative institutions within limits prescribed by Allah. Constitutionalism implies that affairs of the state will be controlled by pre-defined chosen principles and orderly procedures.

Clause 3 refers to chosen representatives of the people, which implies the idea of assemblies in the modern sense and provides scope for election in the mod

sovereignty within its own sphere and according to the Supreme Court the reference the Holy Quran to the obedience of ulul-amar is equally applicable to the members of judiciary[37].

We must not forget that according to objectives resolution authority resolution authority and not sovereignty is delegated and that too to the State of Pakistan only. People through its chosen representatives who form the legislative bodies are only intermediaries means or stages through which authority is channelized and finally vested in the State. The assemblies come into existence through elections; the other two organs come into being through constitutional law of the country. But this is only a matter of modalities and technicalities through which various institutions necessary for conducting the affairs of the nation are brought into being. Three types of institution are now regarded essential for all nations, each of which takes care separately and exclusively of law making, running the administration and adjudication. Therefore all three of them together constitute the State. Anyone of these three organs cannot therefore, be exclusively termed as "State". here it is important to realise that State in this Islamic conception is nothing but an agency for enforcing Quranic principle and injunctions and that Judiciary as an integral part and organ of State has vital function to perform in this connection. In this conception, therefore, it is altogether unrealistic to consider Judiciary as something separate and distinct from "State".

However, even if we accept the position that the legislative body is the exclusive repository of the divine sovereignty as claimed in the argument above still the conclusion sought to be drawn from it does not follow. It is a

37 P.L.D. 1992 S.C. 595 at 619 in para marked F. See also at P.169 in para marke "G" where after quoting a passage from Maulana Amin Ahsan Islahi (مولانا امین احسن اصلاحی) Taddabar-ul-Quran (تدبر قرآن), the conclusion has bee drawn that "this shows that the judiciary too can exercise the delegated divin

judiciary. The matter can be sorted out through legislative review rather than judicial review.

Here every thing depends on what we mean by the term "State". The question is what does the term "State" mean? Furthermore does it mean parliament only? The only definition of State is found in Article 7 of the Constitution. But Article 7 was introduced keeping in view the enforcement of fundamental rights and principles of policy. The Article 7 itself specifically indicates that the definition of State therein includes Federal Government and the authority competent to make laws to levy taxes which implies legislative bodies of every description. Judiciary is not included in this definition. This is obviously because only the executive and the legislative body can possibly make transgressions of a fundamental right and principle of policies. The fundamental rights were being guaranteed against these two institutions of the State. Judiciary's role is different from these two organs, because its job is to ensure and enforce the fundamental rights. It is significant that Article 7 itself contains a general rider clause to the effect the unless the context otherwise requires". In other words there is no fixed and exhaustive definition of the State in the constitution and the constitution itself requires that the term "State" will take meanings according to the context and circumstances of each case. In other definition of the State contained in Article 7 of the Constitution is merely functional and adhoc, and not definitive, comprehensive or exhaustive.

In all systems of law and government particularly in federal system judiciary is regarded one of the three organs of State which are equal and co-ordinate. The idea of federation itself implies necessarily the imposition of limits on all authorities and all kind of institutions. This by itself insures pre-eminent rather than equal status for judiciary. In fact it is recognized even in the judgment of the Supreme Court itself that judiciary is one of the three limbs of the State which exercises the delegated functions of the divine

from the opposite and contradictory direction. Thus a situation of constitutional deadlock comes into being. The task for the court in a situation like this is to see whether some value or principle in the constitution itself can be found which might add decisive weight to one of the repugnant provision. In such circumstances the court itself can take the necessary remedial step in order to cope with the situation of repugnancy and the matter need not be consigned to the parliament. As far as Article 2-A is concerned, we have already established by means of a variety of considerations and detailed analysis that it is the most fundamental and the most weighty provision of our constitution. But for the sake of arguments even if we do not consider the content and subject matter as a ground of superiority directly, the Article 2-A must nonetheless be given the precedence due to the folioing fact. The fact is that if it is not done it would involve as a necessary result and incident the violation of oaths in the spheres of both legislative and executive organs of the State. If we are ready to tolerate even this consequence such an attitude can only be described as perverse and degenerating from the stand point of legality and proprietary.

LEGISLATIVE BODIES AS EXCLUSIVE REPOSITORIES OF SOVEREIGNTY:

There is another and alternative line of reasoning which has received the stamp of approbation from the Supreme Court. This argument focusses on the language of the Objectives Resolution itself and contends that according to objectives resolution sovereignty has been delegated to the State. The idea of State has been linked with the chosen representatives of the people which in its turn is linked with the idea of people As such the legislative body is the exclusive repository of the sovereignty. Therefore, in case there is internal conflict of the constitution of the kind involved in Hakim Khan's case, the resolution of the conflict lies within the competence of the legislature rather than

means a judge or an arbitrator. The command is therefore clear from All Almighty and directly addressed to all judges in an Islamic State that they must perform their judicial functions in accordance with what has been revealed by Allah Almighty. What an extraordinary situation we have here! The Divine and actual sovereign Almighty Allah and His delegatee the legislature of Pakistan gave spoken with one voice. Both have addressed the judges directly in very clear, unmistakable and insistent terms. What they have said enjoys passionate support of the people of Pakistan which is borne out by their participation in the struggle for Pakistan and various powerful movements for Islamic causes in the subsequent history of Pakistan. But believe it or not whatever all of them join together to demand and lay down cannot be made enforceable in Pakistan. Such is the power of judiciary. One is reminded here of a remark of Justice Harlan Stone, to the effect that [36]The only check on our own exercise of power is our sense of self-restraint".

CONFLICT RESOLUTION:

This is the stage where we can také up a basic misconception regarding the function of the court involved in the context of Hakim Khan's case. This misconception has to be dispelled, because it is at the root of all confusion. In the context of Hakim Khan's, it is wrong to speak of striking down a constitutional provision. The true function involved here is of conflict-resolution in the light of some discoverable principle or value or latent meanings within the ambit of constitution itself. We have noted already that whenever there are two or more repugnant provisions in the constitution, all of them cannot stand together in the constitution at the same time. This is a necessary consequence and inherently involved in the logic of repugnancy because whenever one of these provisions is attracted, the other repugnant provision is also attracted

36 United States v. Bulber 297 V.S.I (1936) 78 - 79.

"To thee we sent the scriptures in truth confessing the scriptures that came before it, and regarding it in safety! So judge between them by what God hath revealed and follow not their vain desires, diverging from the truth that hath come that hath come to thee."

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَهُمْ
(المائدہ:۴۹)

"And this (He commands) judge between them by what God hath revealed and follow not their vain desires".

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ (المائدہ:۴۸)
"اب تم لوگوں کے معاملات کے فیصلے اس کتاب کے مطابق کرو اور ایسے حقائق مل جانے کے بعد لوگوں کے خیالات و خواہشات کے پیچھے پیچھے مت چلو"۔
اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا
(الانعام:۱۱۵)
"(ان سے پوچھو) کیا میں اللہ کو چھوڑ کر کسی اور قانون کے مطابق تمہارے معاملات کے فیصلے کرنے لگ جاؤں حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایک واضح اور مکمل ضابطہ قانون بھیجا ہے"۔

وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ○ (الکہف:۲۶)
"اور وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔"
یعنی اس کے قانون کے ساتھ کسی اور قانون کو شامل نہیں کیا جا سکتا۔

It can be noticed that practically the same contents with a change of only one word at the end have been revealed in the form of first three verses quoted above. This is an eloquent indication of the emphasis intended by Allah Almighty. It is significant that only one and the same word is used and repeated in all three verses. The verb is (A) يحكم which means to judge or to adjudicate. The word (B) حكم is a derivative from the same root and

one should prevail, the effect of a constitutional provisions i.e. 253 (2) or the effect of judicial pronouncement. The true position is that Article 253 (2) having been triggered into action by law relating to land reforms, its effect is still very much operative because to stop its effect a constitutional amendment is needed.

The words "shall be given effect to accordingly" occurring in Article 2-A are rather significant. These words can not have been aimed at the parliament, because parliament after it has passed the law can only amend, modify, repeal or annual that law, but it cannot do anything to give effect to it. The constitution - makers have obviously addressed these words to the courts in the main. These words have been brushed aside due to reasons and legal propositions set out in the judgment of the Supreme Court. But Allah Almighty whom the constitution recognizes as the only sovereign from whom all institutions individuals and organs of state derive legal and constitutional authority has also spoken on the subject making a direct address to the judges in the following verses of the Holy Quran:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ○
(المائدہ : ۴۴)

"If any do fail to judge by what God hath reveled, they are no better than non-believers."

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○(المائدہ:۴۵)

"If any do fail to judge by what God has revealed, they are no better than wrong doers."

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○(المائدہ:۴۷)

"If any do fail to judge by what God hath revealed, they are no better than those rebel."

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ (المائدہ:۴۸)

conveniently disregarded, firstly that the laws under challenge were inseparably integrated into Article 253. Therefore, in a case like this even an indirect effect that completely and totally negates a constitutional provision can never be legally valid nor can it be treated as merely indirect consequence. Secondly, as soon as the impugned laws came into effect, they had triggered into action, the negative operation of article 253 (2) through invalidity clause contained therein remains very much operative,. even now. The negative operation of Article 253 (2) cannot be arrested short of amendment in the constitution. It is strange that what the legislature could not achieve directly because it has not power to pass any legislation that contravened article 253 (2) it could achieve indirectly by a clever tour-de-force of providing an opening to the courts. It could create a new and special jurisdiction under provisions of Chap. 3A of Part 7 of the Constitution and the court under these provisions could give a judicial verdict which could nonetheless destroy the effect of Article 253 (2). The whole argument rests on a facile assumption that judicial pronouncements cannot be termed as "law" within the meanings of Article 253 (2) and Article 253 it so happens places its embargo on "law" only. In this connection one question is altogether disregarded. The question is how can the legislature empower the courts to do something what under the Constitution the legislature itself has no power to do i.e. destroying the operation of Article 253 (2). A well known principle applies here by analogy. No one can pass on better title than he himself has. The question is if the legislature is debarred from passing any law on the subject, including the laws to vest the required power in the courts to act in the matter, from what other source the court can have derived the power to adjudicate and deliver its judgement in this matter. Now the situation is that the judicial pronouncement of the Supreme Court has struck down the land reforms as un-Islamic and thus defeated the operation of so many constitutional provisions including 253 (2). But it remains an open question even now as to which

any stage notwithstanding its technical and formalistic finding in Zia-ur-Rehman's case. In sharp contrast to this, we find many examples of extra-ordinary judicial activism in respect of rather mundane matters.

Judicial activism was resorted to in [32]Dosso's case on the basis of Han's Kalsen theory, in [33]Saifullah's case on the basis of "National Interest" in [34]Nusrat Bhutto' case on the basis of doctrine of necessity. In the last mentioned case the court was amenable to pressure of necessity to such an extent that a single individual, that is, a Chief of Army Staff who had designated himself a Chief Martial Law Administrator was given an unqualified power to amend the Constitution. He was given this power although amendments in the constitution were not needed by any conceivable logic for the purpose of holding of election which was the declared basis of necessity. More recently in [35]Qazil bash Waqf's case the judicial power of the court has been strained to the maximum if not beyond it. This will be clear from the details given below.

In Qazilbash Waqf case, the Land Regulation of 1972 and Land Reforms Act of 1977 which fixed the ceiling for land holding were struck down on the basis of repugnancy to Islam. The court broke through the protective stonewall erected by Articles 253, 8(3), (24), 268(2), 269 and reinforced by Article 203B (c) of the Constitution. The court admitted that Article 253 would be affected, which in fact was the main and real consequence of the court's decision. It nevertheless went ahead on the ground that any of the constitutional provisions mentioned above, were not under direct challenge. The embargo of the word "law" in Article 253 (2) was circumvented by means of a truly erudite and ingenious argument. Furthermore in this process it is

32 P.L.D. 1958 S.c. (Pak) 533.
33 P.L.D. 1989 S.C. 170.
34 P.L.D. 1977 S.C.47.
35 P.L.D. 1989 S.C.600.

articulates the ideals and higher principles of the nation, and also as a pronouncer and guardian of values. It can also be seen what a tremendous blow is dealt to the very essence and structure of the state, whenever the ideology or higher principle or values on which a nation is based is not given by higher judiciary the place which rightfully and by all logic of history belongs to it. When other organs of the state deviate, depart or disregard ideology the damage is curable but when the same is done by the higher judiciary the damage is almost irreparable. It must be pointed out here that although our higher judiciary has recognised the fact with remarkable consistency that Pakistan is an ideological state, it has not adopted the outlook that must necessarily go with it. This is due to hand-over of long tutelage under British rule which inculcated positivist tradition of law. It is vitally important to appreciate that as soon as we became an ideological state, its necessary consequence was an immense qualitative change, a complete break with the past. Thus relevance of positivist approach in such circumstances can lead to nothing but error and confusion. In an ideological state ideology is the paramount factor. Everything must be subordinated to ideology in an ideological state, or else it would not be an ideological state. Failure to adjust the mental gears to this fact is causing all the problems in appreciating the true meanings and scope of Article 2-A.

JUDICIAL ACTIVISM:

In respect of Article 2-A the court's attitude of judicial hesitancy, exaggerated caution and bashfulness is somewhat remarkable, particularly when we remember that the Supreme Court has consistently stuck to the position that the objectives resolution contains the most fundamental principle, the grund-norms and ideology of Pakistan. Indeed the Supreme Court has not departed from this position at

In view of this situation, [31]J. Allen Smith observed "while professing to be controlled by the constitution the Supreme Court does as a matter of fact control it, since the exclusive right to interpret necessarily involves the power to change its substance. This virtually gives to the aristocratic branch of our government the power to amend the constitution, though that power, is as we have seen practically denied to the people".

In the light of the above discussion the conclusion is inescapable that law is what the Supreme Court says it is. This is in line with Justice Marshal's pronouncement that the judges have inherent obligation to say what the law is because it is inherent in the nature of the act of judging itself. We have already noted above that this view of Justice Marshal was approved and further developed in 1958 in Cooper vs. Aaron case.

This has led modern American Jurists to conclude that law is created not by direct commands of the Government but by the direct pronouncements of the court. Law consists of "rules recognized and acted on the courts of justice" Indeed the authority of the state or the sovereign as the ultimate or final source of law is not denied. But the idea is to emphasise following three facts:-

1. That an act passed by the legislature is not law but "a law" which is really noting but material source of law.
2. That a rule is law because courts of Justice would apply and enforce it in deciding cases rather than courts of Justice would apply or enforce it because it is law.
3. That we should turn to the courts of Justice to discover the true nature and origin of law. In this framework it is self-evident how vital is the role of judiciary as an institution that shelters, nourishes and

31 J.Allen Smith. The Spirit of American Government [Cambridge: Balknap

of that nation. According to [27]Alexander Bickel the judges act as the pronouncers and guardians of our values". The court shapes policy also. During Chief Justice Earl Warren's tenure no one could doubt that the court shapes policy and more often Leads rather follow the public opinion. It has been said that the court possesses the best judgment of the nation. The court's grandest function is to think and reason with the polity on the best application of nation's highest principles, and in that process to discern afresh, articulate and develop them. At the same time, as Alexander Hamilto visualized, the court also acts as the bulwark of the limited government and watchdog over all constitutional infractions.

But the most profound function is the one for the first time claimed for judiciary by Justice Marshal in the case of [28]Marbury Vs. Medison. Therein he propounded the proposition that, "It is emphatically the province and duty of the judicial department to say what the law is'. In 1958 this doctrine was approved and further developed in [29]Cooper Vs. Aarons's case. In that case, it was categorically claimed that judiciary has supremacy over the ultimate meaning of the constitutional text. In a sense the court is the final interpreter of the constitution, and in that capacity, the court is the final and supreme authority on all matters of constitutional nature. This position is re-enforced by two factors. Firstly, although the court's verdict is subject to reversal by means of amendment in the constitution, this amendment itself is subject to the interpretation of the court. Secondly, the legislature cannot keep pace with the court. As [30]Sam Erwin observed "you can't pass constitutional amendments fast enough to control the court".

---

27 Alexander Bickel. "Least Dangerours Branch" PP 24. 25.

28 t.US. (1 Cranch) 137 (1803. 176 180.

29 13.358 U.S.1 (1958). 17

30 Sam Erwin. Statement before (Committee on the Judiciary Sub-committee on the separation of powers. 90th Congress 2nd Session Hearings June 11,

legal systems in some form or the other. This is what inspired a hard-headed realist and secular-minded socialist like H.J. Laski to write to O.W. Holmse, "The truth is that we are witnessing a revival of natural law, and the natural is the purely inductive statement of certain minimum conditions we cannot do without if life is to be decent". Furthermore as [25]Edward. S. Corwin has explained, the idea of an all-governing constitution was surely aided by the general idea of "higher law" or laws of nature antecedent and superior to positive law.

However, the conception of judiciary's role and function takes on a different meaning in a Federal context. A Federal Government is characterised by two sets of authority with a limited and mutually checking power distributed to three organs of the State having their distinct spheres. Keeping this in mind [26]A.V. Dicey has said that federalism means legalism. What it implies is that in a federal government, not authority or organ or state has unlimited and unchecked power and therefore no action on the part of any authority, including the parliament is valid unless it carries legal sanction behind it. Judiciary is the branch that oversees and checks transgressions and overlapping form the scope of limited power exercisable within accurately defined sphere that constitutionalism allows.

Judiciary is therefore the branch that interprets and sapplies the constitution. In this process it ensures that whatever happens in a federal state conforms rigorously to the requirements and mandates of the constitution. It also ensures that at all occasions strict legality is maintained. For this purpose it grapples with the deepest thoughts of the nation. It brings a nation's philosophy to bear on the actions

25 Edward. S.Corwin, "The Higher Law, the Background of American Constitutional Law."

26 Dicey, "Law of Constitution" 10th edition page 175 "Federation, lastly means legalism - the predominance of the Judiciary in the Constitution - the

THE ROLE OF JUDICIARY AND THE OBJECTIVES RESOLUTION

By Sardar Sher Alam Khan, Advocate, Lahore

(Part III)

THE ROLE OR FUNCTION OF JUDICIARY:

At this stage, we must take up a fundamental question which is essential to the understanding of the whole issue. The question is: What under the circumstances should judiciary do and what are the limits of its powers. This will throw useful light on what judges are expected to do in a situation like that of Hakim Khan's case.

An extreme view is represented by Cicero and Chief Justice Lord Coke. Cicero contended for the striking down of positive laws which contravene natural law. "A legislature" he stated" which said that theft or forgery of wills or adultery was lawful would no more be making laws. Then what a band or robber's might pass in their assembly". Similarly, Chief Justice lord Coke laid down in Dr. Bonham's case in 1610 the proposition that an act of parliament which is against common right or reason or repugnant or impossible to be performed" should be struck down by the judiciary. Even Blackstone, the arch-exponent of parliamentary sovereignty, held doubts about parliament's power to enact and enforce statutes contrary to law of God and reason. Due to evolution of English constitutional history this proposition has not taken root in England. This is due to the fact that the doctrine of legislative supremacy which is a revised version of Dicey's doctrine of parliamentary sovereignty became the supreme constitutional principle in England. Nonetheless the fact is that even in England and else-where too the idea of an overriding law expressing a higher truth and a higher Justice has continued to survive and influence the prevailing

خوشبودار کیمیکل

مختلف اقسام کے عطریات' اگر بتی' صابن وغیرہ
کی صنعتوں کے لئے عوامی جمہوریہ چین سے
خوشبو دار کیمیکل (پرفیومری' کیمیکل) درآمد
کرنے کے خواہش مند حضرات رابطہ کریں۔

ربی ٹریڈنگ کمپنی (پرائیویٹ) لمیٹڈ

پوسٹ بکس نمبر238' کراچی74200

نماز قائم کریں' اسی میں نجات اور سکون ہے۔

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

REG. NO. L. 7360
VOL. 43 NO. 3
MAR. 1994

پاکستان کا سب سے زیادہ فروخت ہونے والا

قرشی

جوہر جوشاندہ

فلو، نزلہ، زکام اور گلے کی خراش کا مؤثر علاج

صدیوں سے آزمودہ جوشاندہ
اب فوری حل ہونے والے انسٹنٹ
جوہر جوشاندہ کی شکل میں۔
ترکیبِ استعمال: ایک کپ گرم
پانی یا چائے میں ایک پیکٹ
جوہر جوشاندہ ملائیں
اور جوشاندہ تیار۔
دن میں دو یا تین پیکٹ
جوہر جوشاندہ
استعمال کریں۔

قرشی
تحقیق کی روایت
معیار کی ضمانت

آسان استعمال
مؤثر علاج

Interflow